

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222862

UNIVERSAL
LIBRARY



دوستو! ۱۹۶۷ء عیسوی رخصت ہوا اور ۱۹۶۷ء عیسوی آگیا۔ یا یون
 کیسے کہ زمانہ کی کتاب کا ایک ورق اور اُلٹ گیا اور ہمیں خبر بھی نہ ہونے پائی۔
 اور ہوتی بھی تو کیا کر لیتے کیونکہ یہ ہمارے اختیار میں نہیں کہ اسے نہ اُٹنے دیں
 اب دوسرا ورق جو ہمارے پیش نظر ہے وہ ۱۹۶۷ء عیسوی ہے جنرلیون میں
 طرح طرح کی پشین گوئیوں لکھی ہوئی ہیں کہ اس ملک میں یہ ہوگا۔ اور فلان ملک
 میں یہ۔ مگر قطعی طور پر کوئی نہیں بتا سکتا کہ سیال ہمارے اور ساری دنیا کے
 ساتھ کیسا برتاؤ کرے گا۔

ہر شخص کو سب سے پہلے خود اپنی اور اپنی قوم کی فکر ہوتی ہے۔ لہذا ہم
 بھی سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ ۱۹۶۷ء نے ہمارے ساتھ کیسا سلوک کیا حضرات
 اگر آپ بلائے مائن تو ہم ہی کہیں گے کہ ۱۹۶۷ء ہمارے اور ہمارے دگلڈاز کے لیے
 بدترین سال رہا۔ اس نے ہمیں ایسا سخت اور جگر خراش صدمہ پہنچایا ہے جو ساری
 عمر نہ بھولے گا۔ اور ہمارا دگلڈاز بھی اسے کبھی نہیں بھول سکتا۔ والد صاحب قبلہ مولانا
 عبدالحلیم صاحب مرحوم کی وفات ایک ایسا قومی نقصان ہے جسے ہم کبھی نہیں بھول
 سکتے۔ آپ ادبی دنیا میں ہمیشہ عزت و احترام کے ساتھ یاد کیے جائیں گے۔ اور جس
 زمانہ کو رہا جائے گا اُسی قدر آپ کی عزت بڑھتی رہے گی۔ مرحوم عجیب صفات کے
 بزرگ تھے۔ آپ نے مسلسل چالیس سال سے زیادہ ملک کی ادبی خدمت کی۔ اور آخر

وقت تک اُسی میں مصروف رہے۔ آٹھ دس مہینے قبل آپ کو ایک دماغی شکایت پیدا ہوئی اور ڈاکٹروں اور طبیبوں نے متفقہ طور پر یہ راس دی کہ اب آپ دماغی کام چھوڑ دیں۔ آپ کے وہ الفاظ میں بھی نہ بھولوں گا جو آپ نے اس اثنا میں مجھے تحریر فرمائے کہ ”حکیم اور ڈاکٹر یہ تجویز کرتے ہیں کہ اب میں دماغی کام چھوڑ دوں۔ مگر تم ہی بتاؤ کہ لکھنا پڑھنا چھوڑ دوں تو پھر کیا کروں۔ میرے لیے اس کے چھوڑ دینے سے مرعہ نا بد رہ جائے یا وہ آسان ہے۔“ یہ ادبی خدمت آپ کی ذات کے ساتھ لازم و ملزوم ہو گئی تھی۔ مگر افسوس! آن قدح بشکرت و آن ساقی نہ ماند! مرحوم کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ یہ دگداز ہے جس نے اپنے گزشتہ چالیس سال کے دور میں اتنا بڑا اور ایسا بہترین لٹریچر پیدا کروایا جس پر زبان اردو ہمیشہ ناز کرتی رہے گی۔ دگداز کی پیروی میں ملک میں بہت سے رسالے نکلے اور پچھلے پھولے اور اب بھی نہایت آب و تاب کے ساتھ نکل رہے ہیں۔ مگر یہ دگداز ہی نئی برکت ہے جس نے ملک کو اس طرف متوجہ کیا۔ اور اب تو یہ دیکھ کے ہمیں بہت خوشی ہوتی ہے کہ کوئی مہینہ نہیں جاتا جس میں اردو کے تین چار نئے رسالے اس ملک میں نکلنے نہ شروع ہوتے ہوں۔ مگر کاش اُن میں استقلال بھی ہوتا۔

اس کے سوا مولانا مرحوم کی بیشمار تارتخیں اور سوانح عمریان بھی اردو لٹریچر میں بڑا پایہ رکھتی ہیں۔ ناول تو ایسی کافن اردو میں آپ ہی کی ذات سے شروع ہوا اور آپ ہی نے اُسے پائیدار بنایا۔ تارتخ کو جس آسان اور دلچسپ طریقے پر آپ نے زبان اردو میں رواج دیا وہ آپ ہی کا حصہ تھا۔ اور جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بچہ بچہ میں تارتخی ذوق و شوق پیدا ہو گیا۔ فردوس بریں میں علی و جود دی اور فلور فلور مڈائین، ”بولا جیس“ کے کیرکٹر ایسی زندہ اور جمیتی جاگتی تصویریں ہیں جو ہمیں بھی نہیں بھول سکتیں اور جب تک زبان اردو رائج ہے کبھی نہ مٹ سکیں گی۔

غرض سلسلہ ہمارے لیے ایک ایسا منحوس سال گذرا اور اس نے ہمیں ایسا سخت نقصان پہونچایا ہے جس کی تلافی کسی صورت میں نہیں ہو سکتی۔ سلسلہ ۱۹۲۷ء سے پہلے اکثر ایسا ہوتا رہا کہ دگداز دیر سے شائع ہوا اور دو دو مین تین مہینوں کے

رسالے ایک ساتھ شائع کر دیے گئے۔ مگر اس سال دگلڈ ازبرجلد وقت معینہ پر پڑی پابندی کے ساتھ نکلتا رہا۔

ہم نے تو آپ بیتی سنا دی اب حضرت آپ بتائیے کہ آپ کے ساتھ ۱۹۲۷ء کا سال کیسا رہا؟ اور آپ نے گزشتہ سال بھر میں کیا کیا؟ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو خوش ہوئے کہ یہ تباہی کین کہ ہم نے یہ کامیابی حاصل کی مگر زیادہ تر لوگ سرتیجا کرتے ہی جواب دین گے کہ کچھ نہیں!

اب یہ نیا سال ۱۹۲۷ء ہمارے سامنے ہے۔ جن چاہے کہ وقت کی قدر کر کے کارخانہ قدرت میں کامیابی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اور اس کے ایک ایک لمحے کو اسی حد تک کارآمد بنائیں جس حد تک ۱۹۲۷ء کو ہم نے بیکار ضائع کر دیا ہے۔

حسن کی کرشمہ سازیان

جوانا ملکہ نیپلز

یہ تو اکثر دیکھا گیا ہے کہ عورتوں نے بڑے بڑے حکمرانوں اور شہنشاہوں کے دلوں کو مسخر کر لیا اور ان کے ذریعے سے قوموں اور سلطنتوں پر حکومت کی۔ مگر اس وقت ہم اپنے ناظرین کو یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ انھوں نے دین مسیحی کے سب سے بڑے مقتدا پوپوں پر قبضہ حاصل کر کے کس طرح مذہب عیسوی پر بھی حکمرانی کی ہے۔ کئی پوپ محض عورتوں کے اثر و رسوخ پر تہہ تک پہنچ سکے۔ اور انھیں کے ذریعے سے مسیحی دنیا پر حکومت کرتے رہے یا یہ کہا جائے کہ دراصل ان عورتوں نے حکومت کی۔ انھیں میں ایک جوانا ملکہ نیپلز بھی ہے۔

یہ وہ زمانہ ہے جب کلینٹ ششم پوپ تھا اور قدیم مقدس شہر روما کو چھوڑ کے پوپوں نے فرانسیسی سرزمین کے شہر "اے وگن" کو اپنا مرکز بنایا۔ قرار دیا تھا۔ اگر پوپوں کی تاریخ الگ کر کے لکھی جائے تو یہ صاف نظر آجائے گا کہ جوانا ملکہ نیپلز نے اس تاریخ میں کیسا نمایاں حصہ لیا ہے۔ اصل میں اسی کی وجہ سے پاپائی اقتدار کو فرانس میں عروج حاصل ہوا۔ اور دو تین پوپوں کے زمانے میں وہی دین عیسوی پر حکومت کرتی رہی۔

اُس زمانے کے مورخین کا بیان ہے کہ مجو آنا بڑی حسین ملکہ تھی اور ۳۳۳ء میں جبکہ اسکی عمر صرف سولہ سال کی تھی نیپلز کے تاج و تخت کی مالک ہوئی۔ والدین کا اُسکی کم عمری میں انتقال ہو چکا تھا۔ اور اُسکی شادی کوئی شاہ ہنگری کے بھائی شہزادہ انڈر وک کے ساتھ ہو گئی تھی۔ بد قسمتی سے یہ شوہر ملکہ کو پسند نہ آیا۔ چند ہی روز میں اُس سے نفرت ہو گئی۔ اور دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی طرف سے حسد و رقابت کے جذبات پیدا ہو گئے۔

نیپلز کا یہ زمانہ بڑی بے چینی اور بد امنی کا تھا۔ ہر شخص یہ کہتا تھا کہ کوئی انقلاب ہونے والا ہے۔ مشہور مورخ پٹرارک اسی زمانہ میں نیپلز آیا۔ وہ لکھتا ہے: ”آہ نیپلز کی حالت کیسی افسوس ناک ہے! جس نے اس شہر کو پہلے کبھی دیکھا اگر آج آئے دیکھے تو ہرگز نہ پہچانے کہ یہ وہی خوبصورت شہر ہے۔ دینداری۔ بچائی۔ اور مروت کسی میں نہیں باقی رہی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایسے لوگ آباد ہیں جو ایک دوسرے کو قتل کرنے کے سوا اور کوئی شغل نہیں رکھتے۔ ایک ذلیل اور ادنیٰ درجے کا پادری حکومت کر رہا ہے۔ وہ بظاہر ایک سیلا جو غریبوں کے سراور ننگے پیر پھرا کرتا ہے مگر اصل میں اُس نے جو رستم سے بیشتر دولت پیدا کر لی ہے۔ اس کے گھر میں جاکے دیکھتے تو وہ عیش و عشرت اور حرام کاری کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ یہ پادری جس کا نام بارٹ ہے یہاں کا مختار کل ہے اور ظلم و تعدی میں شاید ہی کوئی اس سے بڑھا ہو۔ یہ شیطان غریبوں کو لوٹتا اور تنگ کرتا ہے۔ امیر واد کیستاتا اور ذلیل کرتا ہے انصاف اس کے نزدیک کوئی چیز نہیں جو اسکی مرضی ہو وہی انصاف ہے۔ ملکہ جو آنا اور شہزادہ انڈر وک دونوں اس سے ڈرتے ہیں۔ سارے شہر میں ایک خوفناک خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ گھروں کے اندر بھی لوگ سرگوشیاں کرتے ڈرتے ہیں کسی کی زبان سے ایک لفظ بھی اس کے خلاف نہ لگایا اور اُسے بڑی سخت سزا دی جاتی ہے۔ کوئی شخص اپنے دلی جذبات کا اظہار نہیں کر سکتا۔“

ملکہ جو آنا کے دل میں اپنے شوہر کی طرف سے نفرت روز بروز بڑھتی گئی اُسے اپنے ایک عزیز کوئی مارٹو سے محبت پیدا ہو گئی۔ ملکہ کا سیلان اُس کی طرف دیکھ کے مارٹو کے دوستوں نے یہ ارادہ کیا کہ شہزادہ انڈر وک اور

پادری رابرٹ دونون کا خاتمہ کر دین تاکہ ملکہ اور اس کا دوست ٹاز ٹوٹاڑوی سے عیش و عشرت کی زندگی بسر کر سکیں۔ اس زمانے کے شاہی درباروں میں اس طرح کا قتل کوئی بڑی بات نہ تھی۔ اُن میں یہ امر طے پا چکا تھا کہ شہزادہ آندر و قتل کر دیا جائے مگر اس پر غور ہو رہا تھا کہ کس طریقے سے اس کا خاتمہ ہو۔

نیلز کا ایک مورخ لکھتا ہے کہ ایک شام کو سب درباری موجود تھے۔ ملکہ ایک جگہ بیٹھی چاندی سونے کے تاروں کا ایک تسمہ بن رہی تھی اس کا شوہر کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ ایک دفعہ قریب سے گزرا تو اُس نے پوچھا آپ یہ کیا بنا رہی ہیں۔ جوانا ایک لمبے پھر خاموش رہی۔ پھر اس نے نظر اٹھا کے معنی خیز تسمہ کے ساتھ آندر کی صورت دیکھی۔ اور جواب دیا "جناب یہ تسمہ ہے اور آپ کا گلا گھوٹنے کے لیے بنا جاتا ہے"

گرمیوں کے زمانے میں بادشاہ اور اہل دربار نیلز سے باہر دہیات کی کھلی ہوا کا لطف اٹھانے چلے جایا کرتے تھے جیسے کہ ۱۸۷۷ء کے موسم گرما میں بھی ملکہ جوانا شہزادہ آندر و اور دباری امرامقام "اے ورسا" میں آگئے تھے۔ یہ ایک نہایت ہی خوشگوار علاقہ تھا۔ ایک رات کو سب اپنے اپنے بستروں پر سو چکے تھے۔ ادھی رات گزر گئی۔ تب ملکہ کی ایک خادمہ اس شاہی آرام گاہ میں آئی۔ اور شاہزادہ آندر و کو جگا کے یہ خبر دی کہ پادری رابرٹ کے پاس سے ایک قاصد آیا ہے اور کسی اہم مسئلہ میں آپ سے فوری گفتگو کرنا چاہتا ہے۔ شہزادہ جسے کسی سازش یا دغا بازی کا وہم و گمان بھی نہ تھا فوراً اٹھ بیٹھا اور چلا کہ اُس قاصد سے ملے۔ مگر وہ اس کمرے سے نکل کے دوسرے کمرے میں آیا تھا کہ سب طرف کے دروازے بند کر لیے گئے۔ اور چند لوگوں نے شہزادہ کو پکڑ کے اُس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔ مومنہ میں کپڑا بٹھونس دیا پھر اسے گھسیٹ کے برآمدہ پر لے آئے۔ اور گلے میں بھانسی ڈال کے تپتے لٹکا دیا۔ ان سازش کرنے والے قاتلوں میں سے بعض فوراً نیچے اتر گئے اور اُس کے سر پکڑ کے زور سے پھینچ لیے تاکہ اس کا کام جلد تمام ہو جائے۔ شہزادہ آندر و کی کھلائی جو برآمدے کے نیچے سو رہی تھی شور و غل کی آواز سن کر

جاگ پڑی یہ دیکھ کے اُس نے غل مچایا۔ مگر اس اثنا میں قاتل اپنا کام کر چکے تھے اور بھاگ گئے۔ اس کھلائی کا بیان تھا کہ جو انا بھی اس قتل میں شریک تھی اس ملکہ میں شہوت پرستی کے جذبات اس حد تک پہنچ گئے تھے کہ اس کے درباریوں میں شاید ہی کوئی ایسا بے صیب ہو جس نے جو انا کے حسن و جمال کے مزے نہ لوئے ہوں۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شہزادہ انڈرو کے قتل میں اگر وہ خود شریک نہیں تو کم از کم اس سازش سے ضرور واقف تھی بعض لوگوں کا بیان تھا کہ خود ملکہ کے حکم سے یہ جرم سرزد ہوا۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ کمان تک صحیح ہے لیکن اگر جو انا اپنے شوہر کے قتل کی ذمہ دار یا کم از کم اس سازش سے واقف تھی تو تاریخ میں صرف ایک اسی ملکہ کا نام ایسا نہ ملے گا جس نے اپنے حسن پرست دوستوں کی مدد سے ایک سیدھے سا دے شوہر کا خاتمہ کر دیا ہو۔ جرائم کی تاریخ میں یہ کوئی انوکھا واقعہ نہیں کہ عورت نے اپنے بے شمار عاشقوں کو خوش کرنے کے لیے شوہر کو قتل کر دیا ہو لہذا جو انا کا اس قتل میں شریک ہونا خلاف قیاس یا غیر ممکن نہیں کہا جاسکتا۔

بعض لوگ یہاں تک کہتے تھے کہ جو انا کے دوستوں نے شہزادہ انڈرو کے ہاتھ پانوں باندھ کے بے دست و پا کر دیا۔ اور ملکہ نے خود اپنے ہاتھ سے شہزادہ کے گلے میں اُسی سمت سے پھانسی لگائی جو خود اس نے بن کے تیار کیا تھا۔

غرض دوسرے دن صبح کو شہر نیلزمین یہ مشہور ہوا کہ بعض نامعلوم قاتلوں نے شہزادہ انڈرو کا کام تمام کر دیا۔ مگر کسی میں اتنی جرأت نہ تھی کہ اس افسوس ناک واقعہ کے تفصیلی حالات کا پتہ لگاتا۔

یہ بالکل غیر ممکن ہے کہ جو انا ایک ایسی سازش سے بے خبر رہی ہو جو خود اُس کے کمرے کے دروازے پر عمل میں لائی جائے۔ اور جس میں اس کے عاشق مزاج دوست بھی شریک ہوں۔ کیا یہ قرین قیاس ہے کہ انہیں بغیر ملکہ کی مرضی کے اتنے بڑے کام کی جرأت ہو سکتی تھی؟ اب یہ خبر سارے ملک میں مشہور ہوئی۔ پوپ کلیمنٹ ششم

نے اس قتل کا الزام جو ان پر صاف الفاظ میں تو نہیں لگایا۔ مگر ان شبہ ضرور کیا اور یہ شبہات بعد کے واقعات سے زیادہ قوی ہو گئے۔ کیونکہ ملکہ نے اپنے شوہر کے مار ڈالے جانے پر کسی جہم کا سوگ نہیں منایا اور جن لوگوں پر قتل کا شبہ کیا جاتا تھا ان کی طرف داری کرنے لگی۔ ہر شخص بخوبی جانتا اور سمجھتا تھا کہ شہزادہ اندرو کے قتل کی ذمہ دار خود ملکہ جو اناسے۔

قاصدوں کے ذریعہ جو انانے شاہ ہنگری اور پوپ کلیمنٹ ششم کو اس افسوس ناک واقعہ کی اطلاع دی اور مقتول شہزادے کے بھائی کوئی شاہ ہنگری کو ملکہ نے یہ بھی لکھا کہ اب آپ ہی میرے محافظ و معاون ہیں۔

پوپ نے یہ خبر سنتے ہی ایک کارڈنل فلیپ کو نیپلز بھیجا۔ اُسے حکم دیا کہ وہ ان جا کے اس کی تحقیقات کرے۔ اور قاتلوں کو پوری سزا دے۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی چیکے سے سمجھا دیا کہ اگر الزام خود ملکہ جو ان پر ثابت ہوتا ہو تو شہادت کو مخفی رکھا جائے۔ اس کارڈنل نے نیپلز میں آ کے تحقیقات شروع کی مگر وہ کسی نتیجہ تک نہیں پہنچنے پایا تھا کہ شاہ ہنگری نے انتقام کی آواز بلند کی۔ اور پوپ سے مطالبہ کیا کہ بحرم ملکہ کو سزا دی جائے۔ پوپ نے شہزادہ اندرو کے قاتلوں کو (بغیر کسی کا نام لیے) بددعائیں دین اور انھیں دینی حقوق سے محروم کر دیا۔ مگر کوئی کے انتقام کی آگ اور اس سے زیادہ اس کے الو العز می کے جذبات کو ان باتوں سے تسکین نہ ہوئی۔ پہلے سے اُس کی دلی آرزو تھی کہ کسی طرح خوبصورت شہر نیپلز اور اس کے سرسبز و شاداب علاقے کو اپنے ملک میں شامل کر لے۔ اب ایک بہانہ ہاتھ آ گیا۔ اور خاص نیپلز میں اُس کے بہت سے طرفدار بھی موجود تھے۔

اس اثنا میں جو ان کو یہ نظر آیا کہ اب میں بے بار و مردگار ہوں سب لوگ بظن ہو کے ساتھ چھوڑتے جاتے ہیں اور سلطنت کی حالت روز بروز زیادہ خراب ہوتی جاتی ہے۔ لہذا کسی مرد کے قوی باز و کواپنا معاون بنانا ضروری ہے۔ ان خیالات کا اظہار کر کے اس نے اپنے عاشق دوست کوئی مارٹو سے عقد کر لیا جو اس کا عزیز بھی تھا۔ اصل یہ ہے کہ اندرو کے قتل ہونے سے پہلے ہی وہ اس کے ساتھ عقد کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اب نیپلز کے زیادہ تر لوگ جو اناناز

خلاف ہو گئے۔ اور اُسے مدد کی ضرورت تھی مگر کوئی مارتو باوجود اپنی مائنتی و شجاعت کے ملکہ کو آنے والے طوفان سے نہ بچا سکا۔

لوئی شاہ ہنگری ایک بہت بڑی فوج مرتب کر کے جرمنی کے درمیانی علاقے سے نکلا۔ اُس نے ایک جھنڈا بلند کیا جس پر مقتول شہزادہ اندرو کی تصویر بنی تھی۔ اُس نے جوانا کے ملک پر حملہ کیا اور بغیر کسی مزاحمت کے نیپلز کے پچھلے ملک تک آ پہنچا۔ جوانا نے یہ نصیبت دیکھی تو ارادہ کر لیا کہ اسے وگن میں جا کے اپنے محلے کو لوپ کے سامنے خود پیش کرے۔ یہ بھی عام طور پر مشہور تھا کہ موجودہ لوپ صاحب خوبصورت عورتوں کے بہت دلدادہ ہیں اور اُن کے ساتھ خصوصیت سے پیش آتے ہیں۔ جوانا کو اپنے حسن و جمال پر ناز اور دعویٰ تھا کہ ممکن نہیں کوئی میری صورت دیکھے اور فریفتہ نہ ہو جائے۔ خود وہ جانے سے ایسا یہ فائدہ بھی نظر آیا کہ اپنی دلکش و دلفریب آواز سے لوپ اور اُن کے مشیرون کو اپنی بیگناہی کا یقین دلادوں گی اور وہ ساری سچی دنیا میں میری بیگناہی کا اعلان کر دیں گے۔ ان خیالات کو دل میں لیے ہوئے جوانا شہر آئے وگن میں لوپ کے اس با عظمت دربار میں پہنچی جو شان و شوکت کے لحاظ سے یورپ کے تمام شاہی درباروں سے بڑھا ہوا تھا۔

لوپ نے ملکہ کے لیے باقاعدہ دربار منعقد کیا خود لوپ ایک سنہرے تخت پر جلوہ افروز تھا۔ اس کے جسم پر برف کا سفید لباس تھا جو اس وقت چاندی کی طرح چمک رہا تھا۔ پانی کا تہر تاج سر پر تھا۔ اس کے گرد ایک نصف دائرہ میں گل کارڈنل سرخ لباس پہنے بیٹھے تھے۔ امرا شہزادے مختلف مالک کے حکمران اور سفیر اپنے اپنے رہنوں کے لحاظ سے جلوہ افروز تھے۔

مازنین ملکہ جوانا کو جس کا چہرہ اس وقت نہر دہو رہا تھا دکھا کر ڈنل اس شاندار دربار میں لائے۔ ملکہ کے پیچھے اس کے درباری اور امرا تھے۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی وہ پاپائے مقدس کے تخت کے پاس آئی۔ وہاں تک پہنچنے سے پہلے وہ تین دفعہ تعظیماً جھک کے آداب بجالائی۔ پھر

آگے بڑھ کے پاپے اعظم کے جوتے پر جو صلیب کا نشان بنا تھا اُسے چومے اور آنکھوں سے لگا لگا یا۔ اس کے بعد اپنے رکتے کے اعزاز کے لحاظ سے اُسے پوپ کے ہاتھ کو بھی بوسہ دینے اور آنکھوں سے لگانے کی عروت نصیب ہوئی۔

پوپ کلینٹ ششم اپنے زمانے کا بڑا ایدار مغز حکمران تھا۔ زاہد خشک ہونے کے بجائے اُس میں مروّت اور سب سے زیادہ جن و عشق کے جذبات موجزن تھے۔ حسین عورتوں پر وہ ہمیشہ مہربان رہتا۔ اور اُن سے بڑے اخلاق سے پیش آتا۔ جو انانیت حسین ملکہ تھی لہذا اس موقع پر بھی کلینٹ اس کے ساتھ نہایت اخلاق اور مہربانی سے پیش آیا۔ اُس نے ملکہ کو جو ایک مجرم کی حیثیت سے جھکی ہوئی سامنے کھڑی تھی شفقت کے ساتھ اٹھا کے گلے سے لگا لیا۔ اور چند لفظوں میں اُس کی تسلی و تسفی کر کے اپنے پاس بٹھالیا۔

جو ان کوئی معمولی عورت نہ تھی۔ وہ بڑی عقلمند ملکہ تھی اس وقت بااقتدار جھون کے سامنے حرم سے اپنی بریت ثابت کرنے کی کڑی ہوئی۔ حسین شہزادی نے اپنی مظلومی کی داستان غم ایسے انداز سے بیان کرنی شروع کی کہ شخص آپ سے باہر ہو گیا۔ ذہین اور قابل ملکہ نے موقع کے لحاظ سے لاطینی زبان میں تقریر کی۔ اُس زمانے کے سب مورخین بالاتفاق لکھتے ہیں کہ اس کی یہ تقریر فصاحت اور مہجربانی کی ایک بہت بڑی مثال ہے۔ اس نے اپنی بیگناہی اپنی عورت اور اپنی سلطنت کی حمایت میں تقریر کی۔ اور جان تک زبان نے یاری دی اپنی سُرملی آواز اور دلفریب لہجے میں کوئی ایسی بات نہیں اٹھا رکھی جو سننے والوں کے دلوں کو اپنی طرف اُکلی نہ کر سکے۔ وہ نوجوان حسین دلفریب اور خوش بیان تھی۔ اُس کے بیان نے جادو کر دیا۔ اُس کی تقریر کا سامعین کے دلوں پر ایسا اثر پڑا کہ سننے والے حیرت میں رہ گئے۔ جو کچھ وہ کہتی جاتی سب اس کا اعتراف کرتے جاتے تھے۔ اُس کی اداؤں نے پوپ اور کارڈنلون کے دلوں میں بلا رور عایت انصاف کرنے کے بجائے حسین و دلفریب ملکہ کی طرف داری کا خیال جان گزین کر دیا۔ اس سے پہلے پوپ کو بھی یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ ملکہ اس شائش قتل میں ضرور شریک ہے اور مشہور تھا کہ اسے ملکہ سے نفرت پیدا ہو گئی

ہو۔ ملکہ کے دربار میں آنے سے پہلے چاہے کچھ ہی خیال ہو مگر جوانانے وہاں پوپ کے پوپ اور اُس کے ساتھ کل کارڈنوں پر فتح پائی۔ اُن کا خیال بالکل بدل گیا۔ اور اب وہ سب ملکہ کے طرفدار اور حامی تھے۔ اہل یہ ہے کہ ملکہ کو محض اپنے حق جمال کی بدولت کامیابی حاصل ہوئی۔ اگر کداحی حسین نہ ہوتی یا اس کا فیصلہ نہ ہوتا تو اس کی پاداش میں کسی کسی کے بچے عورتیں ہوتیں تو خدا معلوم کیا نتیجہ ہوتا۔ اور ملکہ کو اس کی پاداش میں کسی کسی سزائیں جگتنی پڑتیں۔ مگر ملکہ کا بھڑنا بیان ختم ہونے سے پہلے ہی کئی کارڈن اُس کو دام محبت میں گرفتار ہو چکے تھے۔ اس کی دلکش آواز دلفریب آواز اور خوش بیانی نے مخالفین کو بھی مسح کر لیا۔ اور سب نے ایک زبان ہو کر یہ راے دی کہ ملکہ بالکل بگناہ ہے۔ اور صرف بگناہ ہی نہیں بلکہ اس کے طرز عمل میں کسی کو شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ پوپ کیمینٹ پر بھی اس کا پورا جادو چل گیا تھا۔ اور اس نے اپنے مشیون کی راے کی تائید کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ جوانا بالکل بے گناہ ہے۔

دربار درخواست ہوا۔ جوانا فتح مندی کی شان و شوکت سے واپس چلی اس کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ پوپ کا جی تو یہی چاہتا تھا کہ اس کے جاے قیام تک پوپ چلے جائے۔ مگر پاپائی و قار کو قائم رکھنا بھی ضرور تھا۔ مجبوراً کمرے کے باہر تک پوپ نچا کر رخصت کیا۔ جوانا سمجھ گئی تھی کہ پوپ پر میرا جادو چل گیا ہے لہذا اُس نے اسی وقت نیپلز واپس جانے کی اجازت چاہی۔ پوپ نے اسے کسی طرح منظور نہ کیا۔ اور چند روز اسے وگ نن میں رہنے پر اصرار کیا۔ اسی روز شام کو پوپ نے ملکہ کی ایک بڑی شاندار دعوت کی جس میں کل معززین دربار پاپائی اور دیگر امرا اور شہزادے مدعو تھے جوانا دعوت میں شریک ہوئی۔ مگر وہ کھانا کھاتے ہی واپس چلی گئی۔ وہ جلسہ اور ناچ میں شریک نہیں ہوئی۔ اس نے کہا کہ مجھ سے یہ نصیب آوارہ وطن کے لیے جس کا دلچ و تخت چھن گیا ہو ناچ گانے کے جلسے میں شریک ہونا

مناسب نہیں۔ پوپ نے اس وقت اس سے وعدہ لے لیا کہ وہ دو چار مہینے اسے وگ نن میں رہے گی۔ اہل یہ ہے کہ جوانا کا واپسی پر اصرار ایک انداز معشوق تھا۔ وہ بخوبی سمجھ رہی تھی کہ پوپ کے قریب رہ کر اور اُس کی منظور خاطر بن کر میں کیسے فائدے حاصل کر سکوں گی۔ وہ اپنی حالت کو جانتی تھی جو الزام اس پر لگایا گیا

تھا اس سے تو بیشک بری کوئی گئی تھی مگر اس کا ملک ابھی تک دشمنوں کے قبضے میں تھا۔ یہ ضرور تھا کہ نیپلز کے لوگ اتنے ہی دُشمنوں میں ہنگری والے حملہ آوروں کے مظالم سے بے حد پریشان ہو گئے تھے اور ملکہ جوآنا کی واپسی کے آرزو مند تھے مگر اتنی قوت کس میں تھی کہ انھیں لڑ بھر کے اپنے ملک سے نکال دے۔ اگر اتنی قوت ہوتی تو ملکہ کو اپنا ملک چھوڑ کے بھاگتا ہی کیوں پڑتا۔ بہر حال کسی قدر پس و پیش کے بعد جوآنا نے پوپ کے ارشاد کو قبول کر لیا۔ اور دو تین مہینے اسے وگ نن میں رہنے پر آمادگی ظاہر کی۔ پوپ نے کہا کہ اس اثنا میں نامہ و پیام کر کے ہنگری کے بادشاہ کو اس پر آمادہ کیا جائے گا کہ وہ ملکہ جوآنا کے علاقے سے اپنی فوجیں ہٹائے۔

مگر یہ معاملہ جس قدر آسان نظر آتا تھا اس آسانی سے طے نہ ہو سکا۔ کوئی شاہ ہنگری نے اپنے مفتوحہ علاقے کے کسی حصے کو چھوڑنے سے قطعی انکار کر دیا۔ اتنے دنوں میں جوآنا نے پوپ کو اس قدر اپنے قابو میں کر لیا کہ اب وہ بالکل اسی کے ہاتھ میں تھا۔ وہ بغیر جوآنا سے مشورہ لیے کوئی کام نہ کرتا۔ اور ملکہ کے بغیر اُسے کسی طرح چین نہ پڑتا۔ ہر وقت ملکہ جوآنا اُس کے پاس رہتی۔ خاص مقام اُسے وگ نن میں پوپ صاحب رونق افروز تھے نیپلز کی سلطنت میں شامل تھا۔ پوپ نے اس شہر کو اتنی ہزار اشرافیوں کے معاوضے میں خرید لیا۔ اگرچہ یہ قیمت برائے نام تھی مگر ملکہ کو اسی پر راضی ہونا پڑا کیونکہ اُسے ابھی پوپ سے بہت کام لینا تھا۔ پوپ نے اپنے ایک کارڈنل کو توئی شاہ ہنگری کے پاس نیپلز میں بھیجا تاکہ اسے نیپلز سے فوجیں ہٹالینے پر آمادہ کرے۔ پوپ کی جوآنا پر اتنی مہربانی دیکھ کے کوئی کو بھی ہی مناسب معلوم ہوا کہ نیپلز چھوڑ دے۔ وہ وہاں سے چلا گیا اور جوآنا نہایت ترک و احتشام کے ساتھ نیپلز میں آئی جس پر رعایا نے بڑی خوشیاں منائیں۔ اب ملکہ کی قدر بہت زیادہ ہو گئی۔ دربار پاپائی نے اُسے تاج و تخت واپس دلایا تھا۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ خود پوپ اُسے اس درجہ چاہتے اور اس کی اتنی عزت کرتے تھے کہ کسی دوسرے کی وہاں تک رسائی نہ تھی۔ اُس زمانے میں کوئی اتنی جرأت نہیں کر سکتا تھا کہ کہتا پوپ صاحب کیسی شرناک زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اُس وقت سب کا یہ خیال تھا کہ اگر پوپ کے حرکات و سکنات پر

ذرا سی بھی نکتہ چینی کی گئی تو بس آخرت میں نجات کی کوئی صورت نہیں کہو کہ پوپ حضرت مسیح کے پیچھے جانشین ہیں۔ اور ان پر نکتہ چینی کرنا سخت ترین گناہ ہے۔

پوپ کے فقط ایک اشارے کا اتنا اثر ہوا کہ نیپلز حملہ آور دن سے آزاد ہو گیا۔ لوئی شاہ ہنگری کو پوپ سے سزا جانی کرنے کی جرات نہ ہوئی۔ وہ اپنی فوجیں لے کر واپس چلا گیا۔ اور صلح ہو گئی۔ نیپلز میں خوشی کا جشن منایا گیا۔ ملکہ جوآنا اور اس کے دوسرے شوہر کوئی طائر نہ کی۔ تاج پوشی کے جلسے ہونے لگے۔ پوپ نے خاص طور پر اپنے ایک کارڈنل کو مبارک باد دینے کے لیے بھیجا۔ غرض دن عید اور رات شب بارات تھی۔ جوآنا اس دامان کے ساتھ نیپلز پر حکومت کرنے لگی۔

صرف چند ماہ اس آرام و اطمینان سے گزرے تھے کہ پوپ کلیمنٹ ہشتم نے عالم جاودانی کی راہ لی۔ اور جوآنا کا حامی و مددگار ہی نہیں بلکہ حاشا زار و دنیا سے رخصت ہو گیا۔

کلیمنٹ کی خوش اخلاقی اور مہربانی کی بدولت جوآنا کی جلاوطنی کا زمانہ بھی ایسے پیش و آرام سے گزرا کہ شاید خاص نیپلز میں بھی اُسے وہ ٹھٹھ کبھی نہ آیا ہو۔ اُس کی خاطر سے آگے و گئے نین روزانہ دعوتوں اور جلسوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اس زمانہ میں کلیمنٹ نہیں بلکہ جوآنا ہی دراصل مسیحی دنیا پر حکومت کر رہی تھی۔ بڑے بڑے بادشاہ اور جاگیردار اسی کے پاس اپنی غرض لے کے جاتے اور وہ جیسا چاہتی پوپ سے حکم دلا دیتی۔ جوآنا کو پوپ کی موت کا بڑا افسوس ہوا۔ اس زمانے میں اقتدار پاپائی بہت ترقی کر گیا۔ جن محالات میں کلیمنٹ کے پیش و ناکام رہے تھے اب جوآنا کی دانائی و فراست کی بدولت اُسے کامیابی ہوئی اور آخر میں یہ حالت ہو گئی کہ سارے یورپ میں کوئی حکمران نہ تھا جو پوپ کے حکم سے سزا جانی کی جرات کر سکے۔

کلیمنٹ کے مرنے کے بعد کارڈنلون نے گرجے کی اصلاح کرنی چاہی اور اس فرض کے لیے کسی ایسے شخص کو پوپ منتخب کرنے پر آمادہ ہوئے جو خود اس قسم کی عیاشیوں اور بدکاریوں میں مبتلا ہو۔ اور نہ دوسرے پادریوں کو اس کی اجازت دے اپنی خیال میں ایک نہایت ہی شقی اور پرہیزگار کارڈنل کو

انھوں نے منتخب کیا جو آؤ سنٹ ششم کے نام سے پوپ ہوا۔ یہ زیادہ دنوں
نہیں زندہ رہا۔ اور اس کے زمانے کا کوئی خاص واقعہ نہیں ہے۔ یہ ایسی قیود
کے ساتھ پوپ ہوا تھا۔ اور اسکی طبیعت میں زہد و تقویٰ اس درجہ تھا کہ اس نے
دربار پاپائی میں عورتوں کی مداخلت کو پسند نہیں کیا۔ مگر جوآنہ نے اپنی دانشمندی کی بدولت
اُسے بھی اپنا دوست بنائے رکھا۔ اور ایسے پوپ سے اس سے زیادہ کیا توقع کی جاسکتی
تھی۔

اب ملکہ کے دوسرے شوہر لوئی کا رٹو کا بھی انتقال ہو گیا۔ پوپ آؤ سنٹ ششم
نے اپنی جانب سے ایک پادری کو جوآنہ کے پاس نیپلز میں تعزیت کی رسم ادا کرنے بھیجا۔
ہاں اس پادری اور جوآنہ میں ایسی گہری دوستی ہو گئی جو غیر بھرتاؤں میں رہی۔
اسی اثنا میں پوپ آؤ سنٹ ششم نے انتقال کیا۔ اور جوآنہ کے اثر سے
یہی پادری جو پوپ آؤ سنٹ کی جانب سے انیلز آیا ہوا تھا آربن چیم کے نام سے
پوپ منتخب ہو گیا۔ اب کیا تھا۔ یہ جوآنہ کا دوست تھا اور جوآنہ ہی کے اثر سے پوپ بنا تھا۔
جوآنہ کا اثر کلیمنٹ کے زمانے سے اب بہت زیادہ بڑھ گیا۔ پوپ آربن کے وقت
میں جوآنہ کے قوت و اقتدار کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اسی کی مرضی کے مطابق کلی امور انجام
پاتے۔

جوآنہ ایسی عورت نہ تھی کہ زیادہ زمانے تک بیوگی کی حالت میں گزارتی۔ اُس
نے فوراً تیسری شادی کی فکر شروع کر دی۔ اور تیسرے شوہر کا انتخاب زیر غور تھا۔ مگر اس
میں ایک مشکل یہ آ پڑی کہ پوپ آربن کو یہ پسند نہ تھا کہ ملکہ پھر شادی کرے۔ اس نے جین
ملک کے سب آرنڈ منڈون کو رادھمک کے یا اپنا اثر ڈال کے خاموش کر دیا۔ مگر ایک
ایسا شخص بھی تھا جسکے دکنے کے لیے آربن کو بڑی کوشش کرنی پڑی۔ فرانس کا بادشاہ
جان یہ چاہتا تھا کہ اپنے بیٹے فلپ کے ساتھ اس جین ملک کی شادی کرے کہ اسے اپنی
ہو بنائے۔ بلکہ راسخ پیام دینے کے بجائے جان خود اسے دگن میں آیا تاکہ پاپا
مقدس سے اس اہم معاملے میں مشورہ کرے۔ آربن نے اس شادی کو کسی طرح پسند نہ کیا۔ اسی
وجہ تھی کہ اس شادی سے پوپ بالکل شاہ فرانس کے تابع فرمان ہو جاتے۔ شہر اسے دگن
نیپلز کی عمارت میں واقع ہوا تھا۔ آربن کو یہ نظر آیا کہ اگر یہ علاقہ فرانس کی عظیم الشان

سلطنت میں شامل ہو گیا تو پوپ بھی اس کے زیر اثر ہو جائیں گے۔ اس وقت نیپلز ایک چھوٹی سی ریاست ہے اور بولون پر اتنا اثر نہیں ڈال سکتی جتنا فرانس کی سچی عظیم الشان اور طاقتور سلطنت کا اثر پڑے گا۔

شاہ فرانس کو ملکہ جواں اکیر سے بدظن کرنے کے لیے آربن نے کوئی بات نہیں اٹھا رکھی۔ جواں اکیر کی عشق بازیوں کی ساری داستانیں کہ سنائیں۔ یہ بھی بتایا کہ اپنے پہلے شوہر کو خود اسی نے قتل کرایا تھا۔ اور پھر اس الزام سے بری ثابت ہونے کے لیے اس نے پوپ کلینٹین ششم کی خدمت میں بہت سی اشرقیان زدہ کرکے اپنے فریب عشق میں چانس لیا پھر بھی بیان کیا کہ نیپلز کے درباریوں میں کوئی ایسا نہیں جو جواں اکیر کی شہوت پرستیوں کی بدولت اس کے بستر عیش تک نہ ہو بیچ بکا ہو۔ جواں اکیر ایسی عورت نہ تھی کہ اگر دل چاہتا تو پوپ کے روکنے سے رک جاتی۔ مگر اس رشتہ کو خود اسی نے نہیں پسند کیا۔ کیونکہ وہی عہد فرانس خود اس سے دس بارہ برس چھوٹا ایک کمسن لڑکا تھا دوسرے وہ سمجھتی تھی کہ فرانس اتنی بڑی اور طاقتور سلطنت ہے کہ اس میں شامل ہونے کے برعکس سلطنت نیپلز نیست و نابود ہو جائے گی۔ لہذا ملکہ کو یہ رشتہ مناسب نہ معلوم ہوا اور اس نے فوراً تجارتی کے حکمران جیمس کے ساتھ مشاوری کر لی جو اس زمانے کا سب سے

زیادہ خوبصورت بادشاہ سمجھا جاتا تھا۔ جس اس وقت بے تاج و تخت بادشاہ تھا کیونکہ آراغزنہ کے بادشاہ نے اسے ایک حاکم باہر کیا تھا اور اس نے یار و مددگار بھاگ کر نیپلز میں پناہ لی تھی۔ ملکہ جواں اکیر اس کی جانب مائل ہو گیا۔ اور خود ملکہ نے شادی کا پیام دیا۔ شہزادہ نے ان سب شرطوں کو جو پیش کی گئیں پڑے شوق سے قبول کر لیا۔ اور نہایت ہی شان و شوکت کے جلسوں کے ساتھ مراسم عقد ادا ہوئے۔ پوپ آربن کو یہ شادی پسند نہ تھی مگر اپنی دوست ملکہ جواں اکیر کو ناخوش بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لہذا اس نے ملکہ کو مبارک باد کا پیام بھیجا۔ پوپ آربن اب یہ چاہتا تھا کہ اسے دگن کو چھوڑ کے پھر مقدس و متبرک شہر روما میں جا کے رہے اور پہلے کی طرح اُسی کو اقتدار پاپائی کا صدر مقام بنائے۔ اس میں بڑی دقتیں تھیں۔ سب کارڈنل سرزمین فرانس کی عیش و عشرت کے عادی ہو چکے تھے۔ اس فرحت و جشن مقام کو چھوڑ کر کوئی رہنما نہیں داپس جاتا تھا۔ جب آربن نے یہ خیال ظاہر کیا

سب اس کے مخالف ہو گئے مگر آرن نے کسی کی پروا نہ کی یہاں تک کہ روانگی کے وقت اٹلی مان کرے کے دروازے میں لیٹا گئی کہیں خوشی سے نہ جانے دون کی۔ مگر پوپ نے اس کا کوئی خیال نہ کیا اور اوپر سے بھانڈے نکل گیا۔

مرکز پاپائی کی تبدیلی میں فقط ایک ملکہ جو آنا آرن کی طرف تھی اس وجہ سے نہیں کہ پوپ کے روم جانے سے اس کا کوئی فائدہ تھا بلکہ محض اس خیال سے کہ اس کے دوست اور عاشق آرن کی خوشی ہی تھی غرض پوپ اسے وگنن سے روانہ ہو کے روم میں آگیا۔ سفر کا سارا انتظام ملکہ جو آنا نے اپنے فصول اور جہازوں کے ذریعہ کر دیا۔ روم میں پہونچتے ہی آرن نے خوشیاں منائیں اور قدیم تبرک شہر میں واپس آئے یہ جو امرا و جاگیردار مبارک باد دینے آئے ان میں ملکہ جو آنا بھی تھی اس کا شاندار استقبال ہوا۔ آرن نے شاہ قبرص کو شہر کے باہر تک ملکہ کے استقبال کے لیے بھیجا۔ شہر کے چھ ایک پرکار ڈنل امرا اور بہت سے جاگیردار کھڑے تھے اور سینٹ پیٹر کے گرجے کے زینے تک آ کے خود پوپ نے ملکہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ایسی صورت دیکھتے ہی وہ چار چھ زینے نیچے اتر آیا۔ اور بڑے شوق سے ملا۔ آرن ملکہ جو آنا کا بہت ممنون تھا۔ ملکہ نے اسے ایسے وقت میں اپنی دوستی کی عزت بخشی تھی جب وہ معمولی پادری تھا اور اسے کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ یہ بات خود اس کے یا کسی اور کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ ایک دن وہ حضرت مسیح کا نائب بن کے تخت پاپائی پر رونق افروز ہو گا۔ یہ عزت اسے محض ملکہ کی کوشش اور کارڈنلون میں ملکہ کا اثر ہونے کی وجہ سے حاصل ہوئی تھی۔ پوپ ہونے کے بعد بھی تھا کہ ملکہ اس کی ہر بات کو قبول کر لیتی اور اس کی تائید پر آمادہ ہو جاتی تھی۔ پوپ نے جو آنا کو ساتھ لے جا کر سب سے پہلے پیٹر اور پال کے مقبروں کی زیارت کرائی۔ پھر اپنے شاندار محل میں لے گیا۔ اور اس کے بعد یہ حالت ہوئی کہ محل کے اندر رات دن پوپ اور ملکہ جو آنا میں ساز و نیاز کی باتیں ہوا کرتی تھیں اور کسی کو اندر آنے کی اجازت نہ تھی۔

جو آنا کے روم میں آنے سے پہلے شاہ قبرص کو دربار پاپائی میں بہت رنج حاصل تھا مگر جو آنا کے آتے ہی وہ تشریف لے گیا۔ اور اب جو کچھ بھی جو آنا تھی۔ کل امور اسی کے اشارے پر اور اسی کی مرضی کے مطابق انجام پاتے۔ اور چند روز میں اہل روم اس کا ایک اور ثبوت بھی مل گیا کہ پوپ کے دل میں ملکہ کی کتنی قدر و منزلت تھی۔

قدیم زمانے سے ایک دستور یہ چلا آتا تھا کہ اہل رد اگر سچ کی ایک مخصوص رسم کے موقع پر ہر سال ایک گلاب کا پھول پوپ کے نذر کیا کرتے۔ اس دینی رسم کے ادا کرتے وقت وہ پھول پوپ کے سینے پر لگا رہتا۔ مگر رسم ادا ہو جانے کے بعد پوپ اُس پھول کو اپنے ہاتھ سے کسی ایسے معزز شخص کے سینے پر لگا دیتا جس کی عزت اُن کی نظروں میں سب سے زیادہ ہوتی۔ یہ ایسی عزت تھی جس کے لیے ہر معزز شخص آرزو مند رہتا۔ اور اس مرتبہ سب کا یہ خیال تھا کہ وہ پھول شاہ قبرص کو ملے گا۔ مگر سب کا وہ پھول اور خود شاہ قبرص کو یہ دیکھ کے بے انجیب اور ایسی ہوئی کہ مذہبی رسوم ادا ہونے کے بعد پوپ آرمین نے وہ تبرک گلاب کا پھول ملکہ جوآنا کے سر میں لگا دیا۔ مناسبت کے لحاظ سے پھول لکھنے کے لانا چاہتے تھے مگر یہ دیکھ کے سب شائے میں رہ گئے۔ اور کارڈوٹ سے خاموش نہ رہا گیا۔ انھوں نے پوپ کی خدمت میں عرض کیا کہ اس سے پہلے کبھی یہ عزت کسی عورت کو خواہ وہ کسی رتبہ اور درجے کی ہونیں میسر ہوئی ہے۔ خصوصاً اس موقع پر جبکہ ایک معزز فرمانروا بھی موجود ہے۔ یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ اسے محروم کر کے ایک عورت کو اس کی عزت دی جائے۔ پوپ نے بڑی بے پردائی کے ساتھ جواب دیا کہ اس سے پہلے کبھی تم نے ایک مہولی اور ادنیٰ درجے کے پادری کو بھی تخت پاپائی پر نہ دیکھا ہو گا۔

قواعد اردو۔ مولوی عبدالحی صاحب نے اسے آرمیری سکرٹری انجمن ترقی اردو۔ اورنگ آباد دکن۔ اس کا پہلا ادیشن ۱۲۹۴ھ میں الناظرین نے دکن میں لیتھو میں چھپا تھا۔ اب اس کا دوسرا ایڈیشن انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن کے نائب پریس میں چھپا ہے۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اب اردو کی کتابیں مناسب میں چھپتی جاتی ہیں۔ ہمارے خیال میں یہی ایک کتاب ہے جس میں زبان اردو کے قواعد صحیح اصولی مرتب کی گئے ہیں۔ اس سے پہلے جتنے قواعد لکھے گئے۔ وہ عربی اور فارسی کے اتباع میں تھے اور وہ کسی طرح زبان اردو کو بے سوزدن نہ تھے۔ اردو اپنی نوعیت کے لحاظ سے آرمین زبان ہے اس کی بدترین۔ کہ کتب میں اس کے الفاظ و افعال کے اشتقاق کے طریقے اور قواعد بالکل بھاکا کے ہیں۔ عربی اور فارسی کے جذبات اور عموماً اسماء البدلہ ملے ہوئے ہیں ایسی حالت میں اردو کے قواعد میں عربی اور فارسی کا تتبع کتنا بڑا ظلم ہے۔ ان امور کو پیش نظر رکھ کر یہ قواعد مرتب کیے گئے ہیں جو اردو کی ایک قابلِ فخر تصنیف ہے۔ اس ایڈیشن میں ”روز واقف“ اور ”عروض“ کے ابواب اضافہ کر دیے گئے ہیں۔ قیمت مجلد دو روپیہ آٹھ آنے۔ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن سے منگوانے کے ضرور دیکھیے۔



(جناب مولوی سید ہاشمی صاحب کنارا الہیہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن)
 اکبر کے عہد اقبال و کامرانی میں ایسے ایسے جادو بیان فارسی شعر نے اس ملک میں نغمہ
 خوانی میں کہ محمود و شیخ کا زمانہ یاد آگیا نظری طور پر عربی۔ اور قہمی کے کلام کی آج تک
 عالم ادب میں گونج باقی ہے اور فارسی شعر کا ہر قد و دان اُن کے نام اور کا ناموں سے
 آگاہ ہے۔ مگر ان مشہور اساتذہ کو چھوڑ کر اس مضمون میں ہم صرف اُن اکبری شعر
 کی یاد تازہ کریں گے جو اتنے زیادہ مشہور نہیں اور جن کے پُر لطف کلام اور محاضرات
 میں اس عہد کے ذوق و شائستگی کی جھلک بھی نظر آ جاتی ہے۔

۱۔ ملاقات اسم کاہی

کاہی بلکہ خراسانی آدمی تھا اور ہر چند سن کمولت میں ہندوستان آیا لیکن ایک
 سووس برس اور بعض تذکروں میں دیکھا کہ ایک سو میں برس کی عمر پائی۔ لہذا ہندوستانی
 ہو جانے میں کوئی شک نہیں۔ مگر اس پر نصیب ملک سے کوئی اپنے آپ کو منسوب کرنا نہیں
 چاہتا۔ خراسان کے پٹارون کا یہ سیہ فام و ہتھانی بھی کشور ہندوستان پر اس طرح
 طعنہ زن ہے کہ

کاہی تو بلبل چین آراے کاہی زارغ و زغن خی کہ منہد وستان شوی
 شاید اس کی درازی عمر سے ہی اکتا کر یارون نے خبر اُڑادی کہ قاسم
 کاہی مر گیا اس کا ہم چشم غزالی شاہی لشکر کے ساتھ گجرات میں تھا وہیں یہ خبر سننے
 اور قطعہ تاریخ بھی لکھ مارا۔

رفت بیچارہ کا ہی از دنیا سال تاریخ ادا کر خواہی
چون بیچارہ رفت بشدنا چاہ
اتفاق کی بات کہ تھوڑے ہی دن بعد خود غزالی نے گجرات میں کیا رگی
وفات پائی۔ کا ہی نے بدلہ لیا۔ اور ایک ہجو یہ قطعہ میں ع
”لمحہ دو نے رفت از عالم“
سے تاریخ نکالی۔ اسی درازی دین پر سلطان کسے جو بیٹیفہ ہوا۔ اس کی نقل
آگے آتی ہے۔

معلوم ہوا ہے ملا قاسم کی شاعری موسیقی کے ساز پر دورٹی تھی۔
وہ اس فن میں یگانہ روزگار تھا اور اپنی غزلوں کے لئے بھی خود ہی مقرر و مرتج
کردیتا تھا جتنا پختہ دور ان دنوں ملک ملک میں گائی جاتی تھیں:۔
(۱) مرغ۔ باہر فرق مجھوں پر دن انگیز کرد آتش سوداے لیلیٰ اور سراود تیز کرد
(۲) چون ز عکس عارضش آئینہ پر گل شود گردان آئینہ طوطی بنگر دہلبل شود

ایک عزیز کی مدح و شکر گزاری میں جو دردِ پا کے باوجود عیادت
کے لئے آئے تھے لانے فی البدیہ غزل تیار کی۔
ماندی قدم زار روئے نیا ز من دردے ببا و پائے ترا سرونا ز من
ہر چند وصفِ اصل تو کردم شب فراق کو تہ گشت قصہ دور دراز من

ایک پُر لطف غزل ہاتھی کے تلازمے اور بادشاہ کی تعریف میں لکھی ہے۔
بافیلان میل دیدم دستان خویش را چہ صرفِ راہِ فیل کردم نقد جان خویش را
خاک بر سرِ سینگم چون فیل ہر جامی رسم بد گزیدہ نیم بر سر خود فیل بان خویش را
شاہ فیل انگن اجلال الدین محمد کبرست بد آنکہ بخشد فیل ز ترین شاعرانِ خویش را

اس غزل کا بادشاہ نے ایک لاکھ تنگہ صلہ دیا اور حکم دے دیا کہ ہر دفعہ
جب ملا دربار میں آئے ایک ہزار روپیہ ”باہرزد“ دی جائے مگر شاعری

کی نشان استغنا دیکھئے کہ اُس کے بعد سے پھر شاہی دربار میں کبھی نہ گیا۔
بوستان سعدی کے جواب میں ایک مثنوی ”گل افشان“ لکھی تھی اور
قافیہ سے قافیہ لکرایا تھا۔ اس کا صرف مطلع دیکھئے میں آیا۔

جان آفرین را بجان آفرین بجان آفرین صد جان آفرین
کاشی کے کلام پر ملا عبد القادر بدایونی کی ماقدانہ راسیہ جو کہ ”شعر ادبیار خام است
وہمہ مضمون دیگران۔“ انما ہیئت مجموعی دار و کہ چھکس دران وادی باد شریک نیست“ دوسرا شعر
بیاضی قرالی و کاشی کے محاکمے میں یہ راجی یادگار چھوڑ گیا ہے۔

کاشی و غزالی۔ آن دو لا یعقل مست در غیبت جانی و توای زوہ است
در دہر کسے بشل ایشان گذشت کاشی چہس است و ہم غزالی چہس گشت

ابو الفضل نے اشارہ اور ملا صاحب نے طرح کی ہے کہ علم و فضل کے باوجود اور
مولوی جانی وغیرہ بزرگان صوفیہ کی صحبت پانے کے باوصف کاشی نہایت آزاد
درند مزاج آدمی تھا۔ دنیا بھر کے آدارہ گرد و ادب اش اس کے گرد پیش جمع رہتے
اور کتوں کا بھی بہت شوق تھا۔ سو جلد دل ملا صاحب کے بقول یہ اختلاط باسکان تو
شرط ملک اشعرا ہی ہو گیا تھا۔

۱۸۷۹ء میں وفات پائی۔

۲۔ بیکی غزنوی

نہایت متقی صاحب علم و فضل بزرگ تھا۔ دربار میں دریدہ دہن یتنازی نے یہ فقرہ
کہ ”چہ کنیم با یک نیم۔ روئے بیکی سیاہ“ اُسی پر چست کیا تھا۔ اس کا قصہ اور قطعہ مشہور ہے
کہ ایک مرتبہ تہا لون بادشاہ نے قیام گاہ دہلی کے طاق پر شیخ آذری کا یہ مطلع اپنے
قلم سے بہت خوشخط تحریر کیا۔

شیدہ ام کہ برین طارم نہ راند دست خط کہ عاقبت کار جملہ محمود است
اتفاق سے چند ہی روز کے بعد اُسی مکان کے کونے سے گر کر وفات پائی اور
یہ شعر لکھنا بھی مرنے والے کی کراست و درشن ضمیر سمجھا گیا۔ ملا بیکی نے اس پر

واقعہ کو اس طرح نظم کیا ہے :-
 در نیکہ شاہ ہایون بوقتِ رحلتِ خویش
 نوشت بر درِ سر منزلے کہ ساکن بود
 تحفے کہ عاقبت کارِ حجلہ محمود است
 بحسن عاقبت خود اشارے فرمود
 چو شد حکم قضا منزلش ہاں منزل
 کہ بود قبلہ حاجات و کعبہ مقصود
 بنا برین ہے تاریخ رحلتش گفتم
 بناے منزل سلطان عاقبت محمود

۲- توسنی

ساغر کے راجہ لون کرن کا بیٹا منوہر نام فارسی میں خوب شعر کہتا تھا جس
 ذوق اور ذہانت کے بدولت لوگ منوہر کہنے لگے۔ اور ہندو باپ نے بھی اس پر
 فخر کیا۔ لیکن یہ بات خود اکر کے خلاف طبع تھی۔ آخر منوہر خطاب دے کر بین بین
 راہ کی۔ یہ تخلص بھی بادشاہ کا عطا کردہ تھا۔ اس واقعے کی یادگار میں جو شعر اس نے
 کہے ان میں سے دو یہ ہیں۔

شریت آشنا میا در بزمِ مادر دی کشان
 کر جگر دکن کباب و خونِ دل و ساغراست
 توسنی سرودہ سمند عشق در میدانِ عشق
 میری امین بقصدِ رہرت چون اکبر است

عشق حقیقی کے جوش میں ایک رباعی لکھی کہ نقل کرنے کے قابل ہے۔
 بے عشق تو در جگر لبالب نار است
 بے درد تو در سرم سرا سر خار است
 بختانہ و کعبہ ہر دو در دم کفر است
 مارا بہ یگانگی ایزد کار است

۲- خنجر بیگ

چٹائی امیر اور فاتح دہلی تہر دی بیگ خان کا داماد تھا۔ فنون سپہ گری
 کے ساتھ موسیقی، خوش نویسی، شعر و نجوم وغیرہ علوم و فنون میں بڑی دستگاہ ہم
 پہنچائی۔ دیوان اشعار کے علاوہ تین سو شعر کی ایک مثنوی لکھی جس میں بیت خوبی
 سے بادشاہ کو نصیحت کی ہے۔ مضمون اور اسلوب دونوں اس قابل ہیں کہ ذیل
 میں اس کے جتنے بے سب شعر نقل کر دیے جائیں۔ دوسرے مجھے امید نہیں کہ

منتخب التواریخ کے سوا اور کین یہ مثنوی محفوظ رہی ہو کیونکہ چند ہی سال بعد خجریگ بھی از بکون کی شورش میں حصہ دار تھا۔ اور کست کھا کے بنگاے بھاگا۔ اور پھر اس کی خبر نہ ملی۔

مثنوی

شہر یار اہان عجب جائے ست
ہر زمان اندر و ما شائے ست
چرخ نیزنگ ساز شعبہ باز
ہر زمان بازیے کنت آغانہ
پیش ازین بودہ اندر عالم
تاجداران با سپاہ و حشم
زان دلیران پر ہوا و ہوس
ماند ما رنجناے کنتہ و بس
گر بنیا ثبات دیدند سے
خسروا کار این جان حسود
زین ہمہ کار و بار پشیم و تیج
غرضم این بود ز پیر ستیغ
این زمان کز تو یافت عالم زریب
گر جاے پرید ازین گلشن
سخن من کہ بے ریا باشد
چون بہ خیریت تو می گویشم
سخن زیر یا کہ عسمر بود
شاہ باید کہ در گاہ و بیگاہ
سہو مسکین زیان نان باشد
بگدا منکر خلق و دلق بود
بہ شود کار سلطنت تو زک
چون ترا نوبت جان دارست
تو چو سمعی و ملک تو حسانہ
ذرہ بود چو نور خود نبود
یعنی از کست زندگی ہمہ

ہر زمان اندر و ما شائے ست
ہر زمان بازیے کنت آغانہ
تاجداران با سپاہ و حشم
ماند ما رنجناے کنتہ و بس
انبیاء و چرا رسیدند سے
این چنین ہست و بود و خواہد بود
نام نیک است اصل و آن ہمہ تیج
تو نوبت رسید تا چہ کنتے
حق نگہدار بادت از آئیب
بہ سرا تو باش سائبہ گلشن
گر نصیحت کنم بہ و ابا باشد
سخن حق ز تو چہرا پوشم
بشنو کہ نفس امر بود
از خود و خلق حق بود آگاہ
سہوشہ آفت جان باشد
در دل شاہ منکر خلق بود
بجو منہر ان شہر بہر از رک
لازم ست احتیاط و ہشیارست
خلق گرد تو ہیچ پر دانہ
نیت پر دانہ شمع گر نبود
تو شبانی و اہل ملک رنہ

بجز آگاه همت آمده است گله
 به تو فرمود حق نگهبان
 پس کن رسم انبیا را گم
 عمر خوش گوهریت قیمت دان
 بادشاهی و لے شعاری تو
 عدلی و انصاف وجود و علم و سخا
 همه داری ز لطف یزدانی
 توبه خنده بفیل مست سوار
 تو بدندان فیل و مشت زنان
 تو بحر طوم فیل خجسته کشا
 تو مقابل به اشیر درنده
 توبه جنگ پلنگ بازی کن
 تو ستاده به پیش حله گرگ
 تو گله گیرار از در سهم
 تو شناور به بحر بے پایان
 تو به چنگل بے شکار درون
 تو شب تیره رفته یکم راه
 تو بسر پا برهنه گر دیده
 توبه گرما و دان بجامه درخت
 تو پاده به طرد رانده
 توبه تپیدن ان خصم جنگ آور
 این چه لطف است و این چه خواری
 این دلیریت دور از آمانزه
 گر چه اینها هنر بود بے ریب
 شاه اگر دور از زبان باشد

گله را چون توان گذاشت یله
 منصب انبیاست چو پاستی
 از خود آگاه باش و از مردم
 دولت ملک را غنیمت دان
 در جهان از براس کار تو
 لطف و احسان خلق و مهر و وفا
 چکنم قدر خود نمی دانی
 خلق در گریه بر سر دیوار
 مردم انگشت فکر در دندان
 آستین افشاند از دنیا
 مردم از و هم بر طاف کنده
 روکنان ما به خجسته و ناخن
 به تعجب زد و در خرد و بزرگ
 خلق و عالم به بیج و تاب زوهم
 بر لبش دست شسته از جان
 خلق از ترس و و هم از بیرون
 مردم از پے بنور شعل آه
 خلق در زیر جامه لرزیده
 خلق غرق عرق به زیر درخت
 ما سواره ز کوفت در مانده
 لشکر از هر طرف تماشاگر
 که با و به خویشتن داری
 این شجاعت بتو بود تازه
 لیک از بادشاه باشد عیب
 مردم ملک در امان باشد

شاہ از خویش اگر بود بے غم
ہمہ زبرد ز بر شود عالم
با تو مارا جہان و جہان باید
بے تو جہان و جہان چکار آید
خضر اغور در قصول کمن
خاطر شاہ بہ ابلول کمن
این حدیث تو دور از معنی است
شاہ ازین گفتگوئے شغنی است
او چو پیش خداے مقبول است
دولت او بکار مشغول است
خواب او ہست عین بیداری
مستی او کمال ہشیاری
حق یہ نکس کہ کار ساز بود
از ہمہ کار بے نیاز بود

۵۔ سلطان سبکی

محمد سلطان نام قندھار کے قریب ایک گاؤں سبکی کا رہنے والا تھا ہندوستان میں آیا۔ تو ظریفون نے اس نام کو مہندر کے چھبکی کننا شروع کیا۔ اس پر بہت ہنستا اور بگڑتا تھا کہ کوئی جواب نہیں بن پڑتا۔ نہایت ظریف و آزاد مزاج آدمی تھا ایک دن ملا قاسم کا ہی سے پوچھنے لگا کہ سن شریف کیا ہو گا؟ ملانے جواب دیا "اللہ میان سے دو سال چھوڑا ہوں" سلطان نے برجستہ کہا "آپ کیا فرماتے ہیں میں تو آپ کو دو سال بڑا جانتا تھا ملا قاسم کا ہی بہت ہنسا اور کہا تم ہماری صحبت کے لائق ہو۔ لیکن سلطان کی زندگی کا عجیب واقعہ ملا علی قادر نے یہ بیان کیا ہے کہ اس نے ایک مرتبہ خان زمان خان کی طرح میں قصیدہ لکھا۔ خان زمان خان نے ایک ہزار روپیہ اور خلعت صلیٰ میں دیا۔ ساتھ ہی درخواست کی کہ میری خاطر سے یہ نخلص چھوڑ دو کیونکہ خود خان زمان کا نخلص بھی سلطان تھا۔ شاعر نے یہ سنکر خلعت و صلہ لینے سے انکار کیا۔ اور کہا "سلطان محمد" میرے باپ کا رکھا ہوا نام ہے۔ اور تم سے سالہا سال پہلے سے میں اس نخلص سے شکر کرتا۔ اور شہرت حاصل کر چکا ہوں۔ میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔"

خان زمان جس قدر فیاض و دلیر تھا۔ ویسا ہی حکم کنبد و شعلہ خوبھی تھا۔ ہم مزاج ہو کے کہنے لگا۔ اگر نخلص نہیں چھوڑنا تو مجھے ہاتھی کے لیچے والے ہلاک

کرادون گا۔ بلکہ حکم دے کے ہاتھی طلب کر لیا۔ مگر شاعر نے ذرا پروا نہ کی اور کہا کہ نہ ہے نصیب اس طرح بلا وقت شہادت میسر آجائے۔ ہر چند لوگوں نے سمجھا یا سمجھا یا وہ اپنی ضد سے باز نہ آیا۔ آخر خان زمان خان کے اُستاد علاء الدین لاری نے کہا کہ مولوی جامی کے دیوان سے کوئی غزل نکال کے اسے دیجائے اگر جواب میں فی البدیہہ شعر کہہ دے تو جان بخشی کی جائے ورنہ جیسی رائے ہو۔ چنانچہ دیوان جامی کھولا تو یہ غزل برآمد ہوئی۔

دل خطت را رقم ضعیف آتی دانست بر سر سادہ رخاں حجت شاہی دانست
سلطان محمد نے فی البدیہہ غزل کہی جس کا مطلع یہ تھا۔
ہر کہ دل را صدق سیر آتی دانست قیمت گو ہر خجور را بکما ہی دانست
خان زمان خان اُچھل پڑا اور پہلے سے زیادہ انعام اکرام دے دے کے اسے رخصت کیا۔

حُسن کی کرشمہ سازیاں

(جوانا ملکہ نیپلز ۲)

اہل رومانے ملکہ جھاناکے کئی شاندار جلوس دیکھے۔ یہ تاجدار ملکہ جس نے دو پوپوں پر عشق و محبت کا جادو کر دیا تھا اس عظیم الشان شہر کی بڑی ٹرکون پر کئی دفعہ اس شان سے نکلی کہ کل امرا جاگیردار معزز زمین اور کارڈنل اس کے جلوس میں تھے۔ پوپ آربن نے اپنی معشوقہ ملکہ کو اس سے زیادہ عزت دینے کے خیال سے ایک دوسری مذہبی رسم کے موقع پر بھرے دربار میں جوانا کی مستقل مزاجی اور خوش اخلاقی کی بڑی تعریف کی اور دینی خدمات کے اعتراف میں بابرکت دربار پاپائی سے اسے ایک مصلح تلواری اور ایک قیمتی ٹوپی مرحمت فرمائی۔ جوانا نے شاہ قبرص کا دل رکھنے کے لیے وہ تبرک تلواری اسے دیدی۔ اور ٹوپی جس میں آبدار موتی ٹکے تھے خود رکھ لی۔

پوپ آربن تبدیل آب و ہوا کے خیال سے روم سے باہر مُہِ فضا دہیات میں گیا تو وہاں بھی ملکہ نیپلز اس کے ساتھ تھی۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ جواب کی تیسری شادی جیس کے ساتھ ہو گئی تھی۔ اسے تین بیٹے سے زیادہ نہیں گروے

تھے کہ آراغونہ کے ظالم بادشاہ نے جیس کے باپ کو قتل کر دیا۔ یہ سنتے ہی جیس اُس سے انتقام لینے کے خیال سے نیپلز سے چل کھڑا ہوا۔ مگر راستہ میں اُسے ایک سردار ہنری نے گرفتار کر کے قید خانے میں بند کر دیا۔ بڑی مشکل سے اُس نے یہ افسوس ناک حالت اپنی بی بی ملکہ نیپلز کے پاس کھلا بھیجی اُس نے نامہ و پیام کر کے اور ایک بہت بڑی رقم ادا کر کے اُسے آزاد کر دیا۔ جیس قید سے چھوٹا تو انتقام کا خیال چھوڑ کے سیدھا نیپلز آیا۔ مگر یہاں پہنچ کے اُسے معلوم ہوا کہ ملکہ یہاں نہیں ہے بلکہ رومہ کے دربارہ پاپائی میں عیش کر رہی ہے۔ لوگوں نے اس سے یہ بھی بیان کر دیا کہ وہ رومہ میں بھی نہیں بلکہ اٹلی کی پرفضا دایوں کی تنہائی میں پوپ کے ساتھ مزے اُڑا رہی ہے۔ اسے یہ سن کے بڑا غصہ آیا۔ اور اپنی بی بی کو لکھا کہ فوراً نیپلز میں واپس آؤ۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ اگر تم نے آنے میں ذرا بھی دیر کی تو میں تمہارا راز فاش کر کے سب شاہان یورپ کو اس کی اطلاع دیدوں گا کہ پوپ کے ساتھ تم کیسی شرمناک زندگی بسر کر رہی ہو۔

جوانان و عیالوں میں آنے والی عورت نہ تھی۔ وہ جیس سے زیادہ بخرہ کار اور عقلمند تھی۔ اس نے کسی شوہر کا دباؤ نہیں مانا تھا بلکہ اس سے پہلے دونوں شوہروں کو اپنا غلام بنا کے رکھ چکی تھی۔ وہ جیس کو بھلا کیا سمجھتی تھی۔ آرن بھی بڑا مستقل مزاج شخص تھا۔ وہ جوانا کو اس وقت اپنے پاس سے جدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جب دیکھا کہ جیس کسی طرح نہیں مانتا تو آرن نے اعلان کر دیا کہ جوانا کا عقد جیس کے ساتھ ناجائز تھا۔ کیونکہ ان میں پہلے سے رشتہ داری تھی۔ یہ فقط ایک بہانہ تھا۔ درحقیقت ایسی شادیان ہوتی ہی رہتی تھیں۔

پوپ نے اس کے بعد ہی ایک اور اعلان شائع کیا کہ ملکہ نیپلز کو کامل آزادی و اختیار ہے کہ کسی دوسرے شخص کے ساتھ عقد کر لے۔ اُس زمانے میں پوپ کی جانب سے ایسے حکمناموں کا جاری ہونا کوئی نئی بات نہ تھی۔ آرن سمجھتا تھا کہ اگر جیس کے اسقف اعظم ایک طرف تو اس کا سبق دے رہے تھے کہ فقط ایک شادی کی جائے بلکہ جہان یک ممکن ہو شادی کرنے ہی سے پرہیز کرنا چاہیے۔ مگر اس کے ساتھ ہی جہان کین مذہبی فائدہ نظر آتا تو خود اپنی طرف سے اکثر حکما

اور اُمرا کو یہ مشورہ دیتے کہ اپنی شادی شدہ بیویوں کو طلاق دے کر چھوڑ دیں۔ اور جس سے چاہیں شادی کر لیں۔ کبھی بادشاہوں کی درخواست پر بھی پوپوں کی طرف سے ایسی اجازت دے دی جاتی۔

پوپ آربن پنجم نے بھی اپنے اس اختیار سے کام لیا۔ طلاق کی اجازت دینے کے علاوہ ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ پوپ خود ہی کسی عقد کو مسترد قرار دے دیتے۔ اس معاملے میں بھی پوپ نے وہی صورت اختیار کی۔ اور جو ان کے ساتھ جمیس شاہ تجارت کا عقد ناجائز قرار دے کر مسترد کر دیا۔

اس کے بعد ہی پوپ آربن کے لیے بڑی مصیبت کا وقت آیا۔ اٹلی کے حکمران کیمارگی اُس کے مخالف ہو گئے۔ اور ہر طرف قتل و خونریزی کا بازار گرم ہو گیا جو ان عیش و عشرت کی دلدادہ تھی۔ اس مصیبت میں جو ان نے اپنے عاشق زار آربن کے ساتھ حکمیفین برداشت کرنے کے بجائے زیادہ مناسب خیال کیا کہ اُسے چھوڑ کے خود اٹلی سے چلی جائے۔ وہ ٹیبلز میں واپس آ کے اپنے درباری امرا کے ساتھ عیش و عشرت میں مشغول ہو گئی۔

اٹلی کے ان چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کے خلاف پوپ نے اپنا سا زور اور کل مذہبی اختیارات صرف کر دیے۔ مگر کسی سے کام نہ چلا۔ آخر مجبور ہو کر شہنشاہ جارجس سے مدد مانگی اور وہ بیس ہزار سپاہ کے ساتھ پوپ کی حمایت میں چلا۔ مگر اس کے پہنچنے تک بھی پوپ کو وہاں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہ نظر آیا۔ وہ جب سے اٹلی میں آیا تھا طرح طرح کی مصیبتیں اور پریشانیان ہر وقت موج رہتی تھیں۔ اٹلی کے باشندے جان یہ دیکھتے کہ کوئی حکمران زیادہ قوی ہو جاتا ہے۔ اور ہمیں دبا لے گا فوراً اس کے خلاف ہو جاتے اور کوئی بڑی قوت قائم ہونے دیتے۔ ان فکروں سے پوپ آربن کو ایک دن بھی اٹلی میں آنے کے بعد چین سے بیٹھنا نہ نصیب ہوا تھا۔ اور انھیں فکروں میں اس کی صحت خراب ہو گئی تھی۔

آربن کو اب اس کا بڑا افسوس ہوا کہ میں نے مانتی اُس امن و امان کی جگہ آئے وگرنہ کو چھوڑ کے یہ سب مصیبتیں اپنے سر بول لیں۔ اسے سرزمین فرانس کے امن پسند اور خوش اخلاق باشندے یاد آنے لگے۔ اور دریائے رون کا وہ دلفریب

کنارہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا جہاں وہ خوشنامہ دیکھ رہی تھی۔ اور وہ اس سرزمین سے ڈھکی ہوئی ہاٹریوں میں سے ہو کے گزری تھی۔ اب اُسے یہ معلوم ہوا کہ اس سرزمین کو قدرت نے ہی ایسی اچھی آب و ہوا عطا کر کے عیش و عشرت کا گہوارہ بنایا ہے۔

کارڈنل تو پہلے ہی تو وائس آف کے خلاف تھے۔ اُن کا یہ زمانہ گویا جلا وطنی میں گزرا تھا۔ سب نے یزبان ہو کر پوپ کو آسے وگن واپس چلنے کی صرف رائے ہی نہیں دی بلکہ بڑی عاجزی سے درخواست کی۔ آربن دل میں تو یہی چاہتا تھا مگر کوئی بہانہ ڈھونڈ رہا تھا۔ اتفاقاً اسی زمانے میں فرانس اور انگلستان میں جنگ کے آثار نمودار ہوئے تھے۔ پوپ نے کہا کہ میں وہاں پہنچ کے دونوں سلطنتوں میں سمجھوتہ کرادوں گا۔ یہ خیال ظاہر کر کے پوپ نے آسے وگن واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔

آسے وگن سے چلتے وقت پوپ آربن کی جس قدر مخالفت ہوئی تھی اُس سے بہت زیادہ توجہ و ماحوڑ نے وقت ہوئی۔ مگر آربن نے کسی کی پروا نہ کی۔ اور آسے وگن جانے کے لیے پھر اپنی ہربان ملکہ نیپلز سے جہاز مانگے۔ اُسے کیا قدر ہو گئی تھی۔ وہ تو آربن کی ہر خواہش قبول کرنے کے لیے تیار رہتی تھی۔ فوراً پتہ کھن جہاز بھیج دیے۔ اور پھر دربار پاپائی مع اپنے کل لوازمات کے وہاں آسے وگن کے کنارے سرزمین فرانس میں پہنچ گیا۔ اور آربن بڑی شان و شوکت کے ساتھ آسے وگن میں داخل ہوا۔ لوگ اُس کے استقبال میں خوشی کے نعرے بلند کر رہے تھے۔

آربن کو بیان آئے کہ خوشی تو ہوئی مگر جتنا زمانہ اُملی میں گزرا اس میں سے ایک دن بھی اُسے چین سے بیٹھنا نہیں نصیب ہوا تھا۔ ان فکر وں نے اُسے گھلا دیا۔ اور آسے وگن آنے کے دو ہی تین مہینے بعد اس نے انتقال کیا۔ اس کے مرنے ہی جتنا کی قوت و اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ تین پوپ جو اُن کے سامنے گزرے تھے جن میں سے دو کے زمانے میں دراصل اُسی نے دین سچی کی رہبری کی اور سارا اقتدار اسی کے ہاتھ میں تھا۔ جہاں وہ کسی سے ناراض ہوئی فوراً ایک پاپائی فرمان اُس شخص کے خلاف جاری ہو گیا۔ اور اکثر امراء و جاگیردار محض جہان کی ناراضی کی بدولت دینی حقوق سے محروم کر دیے گئے۔ مگر اس کے بعد اس کی

ساری قوت کا خاتمہ ہو گیا۔ اور آخری عمر پریشانیوں میں بسر ہوئی۔ چند روز بعد
تیسرے شاہ مجارہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ اور جوانانے اپنا چوتھا عقد برکس وک کے
سردار آتھو کے ساتھ کر لیا۔ اس وقت اسکی عمر چھیالیس سال کو پہنچ چکی تھی۔ مگر اب
بھی خُشن و دلکشی کا یہ عالم تھا کہ اکثر لوگ اس کے آرزو مند تھے۔

دربارِ پاپائی میں اب بھی اکثر کارڈنل جوآنا کے طبیبِ فرد اور قدر دان
تھے۔ جوانانے اپنی مرضی کے مطابق پھر ایک نیپلز کے پادری نکولاس کو پوپ منتخب کر دیا
جس نے اپنا لقب پوپ آرنششم رکھا۔ مگر انیسویں صدی کی یہی سب سے بڑی غلطی تھی اس
نے نکولاس کو بالکل نہیں پہچانا تھا۔ یا اُسے بڑا دھوکا ہوا۔ جیسے ہی نکولاس نے پاپائی
اقتدار اپنے ہاتھ میں لیا وہ ملکہ جوآنا کے خلاف ہو گیا اور اُسکی ساری ہربانیوں اور
عنایتوں کو بالکل بھلا دیا۔ اس نے ملکہ کے خلاف سختی کر اکی حکم جاری کرنے کا ارادہ کیا
تو ایک مشیر کارڈنل نے سمجھا یا کہ ملکہ جوآنا کی مخالفت ٹھیک نہیں کیونکہ دو پوپوں
کے زمانے میں اُس نے بڑی عمر گئی سے گرجے کی خدمت کی ہے اور اسی کے ذریعے
سے پاپائی اقتدار کو ترقی نصیب ہوئی۔ مگر اس ناشکرے پوپ نے جواب دیا کہ میں
اس ملکہ کی کوئی پروا نہیں کرتا۔ اور تم دیکھنا کہ عیش و عشرت کرنے کے بجائے چند روز
میں وہ کسی خانقاہ میں بیٹھی جو خاکات رہی ہوگی۔ آرنششم جوآنا کا علانیہ دشمن
ہو گیا۔ اور ملکہ کی جانب سے جو سفیر آتا اس کی تحقیر و تذلیل کرتا۔

یہ پوپ عجیب طبیعت کا واقع ہوا تھا۔ اس کی اپنے مشیر کارڈنلون سے
بھی نہ بنتی تھی۔ پوپ کارڈنلون کو اپنا غلام سمجھتا اور اس کے برتاؤ کی عام طور
پر بھی شکایت تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پوپ اور کارڈنلون میں مخالفت پیدا ہو گئی۔ کارڈنل
اُسے چھوڑ کے چلے گئے۔ اور ایک جگہ جمع ہو کے اُنھوں نے جملہ کیا۔ جس میں یہ سطر
پا کہ آرنششم کا پوپ منتخب ہونا مسترد کر دیا جائے اور کوئی دوسرا شخص پوپ
منتخب ہو۔

جوانانے اس وقت نہایت سچائی کے ساتھ اسکی کوشش کی کہ پوپ اور
کارڈنلون میں جو جھگڑا پیدا ہو گیا ہے رفع ہو جائے۔ مگر پوپ آرنششم نے یہ خیال
کیا کہ ملکہ ہی کی سازش سے کارڈنلون نے یہ جھگڑا شروع کیا ہے۔ لہذا اُس نے جوآنا

کے پاس نہایت ہی سخت الفاظ میں ایک خط لکھا جس میں ملکہ کے عشق و محبت کے گزشتہ واقعات گنوائے تھے۔ لکھا تھا کہ تم ہی نے اپنے پہلے شوہر آئڈر کو قتل کیا۔ پھر پوپ کلیمنٹ ششم اور پوپ آرنیم کے ساتھ کیسی شرمناک زندگی بسر کی ہے۔ یہ لکھنے کے بعد پوپ نے اُسے دھکی دی کہ میں تمہاری کل عشق بازیوں کے راز آشکارا کر کے تم کو مذہبی حقوق سے محروم کر دوں گا۔ اس خط کے الفاظ ناقابل برداشت تھے اور نیپلز کی ملکہ کے جانب سے بھی ویسا ہی ترکی ترکی جواب دیا گیا اب جو انانے بھی پوپ سے علانیہ مخالفت اختیار کر لی اور ان کا رد ٹون کی طرفدار ہو گئی جو پوپ سے ناراض ہو کر دربار پاپائی سے چلے آئے تھے۔ انھیں اپنی سلطنت نیپلز میں پناہ دی اور انھوں نے مقام فونڈی میں اپنی مجلس قائم کر کے اپنی پہلی تجویز کے مطابق آرنیم ششم کے انتخاب کو مسترد کر کے جو ان کے مشورے کے مطابق جینوا کے کارڈنل رابرٹ کو پوپ منتخب کیا۔ جس نے اپنا لقب پوپ کلیمنٹ ہفتم قرار دیا۔

اب سیسی دنیا میں دو پوپ تھے جو ایک دوسرے کو گالیان دیتے۔ اور باہم لڑ رہے تھے۔ اور یورپ میں مذہب کے دو فرقے ہو گئے۔ جو ان کلیمنٹ کی طرفدار تھی جب مقام فونڈی کی حالت غیر محفوظ نظر آئی تو اُس نے جدید پوپ کا دربار ایک دوسرے مقام پر قائم کر دیا۔ اور چند روز بعد وہ خاص مقام آئے وگن میں پہنچ گیا۔

آرنیم ششم نے جو ان کی مخالفت اور اس کے بدنام کرنے میں کوئی بات نہیں اٹھا رکھی۔ یورپ کے بادشاہوں سے درخواست کی کہ اس پر فوج کشی کر کے نیپلز کی حکومت سے معزول کر دیں۔ اور ول کو تو اتنی غرض نہ تھی مگر جو ان کے پہلے شوہر آئڈر کا بھائی کوئی شاہ ہنگری ابھی زندہ تھا۔ اُس نے پہلے ہی ملکہ جو ان کو نیپلز سے نکال باہر کیا تھا۔ مگر پوپ کلیمنٹ ششم کے کہنے سننے سے ملکہ کا عداوت چھوڑ دیا تھا۔ اس وقت وہ پھر حملہ آور ہوا۔

جو ان کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اس نے اپنی بھانجی مارگرٹ کی شادی چارلس ڈرائز کے ساتھ کر دی۔ اور چارلس کو اپنا جانشین بھی مقرر کر دیا۔ مگر اُس نے جو ان کے ساتھ دفاع کی اس مصیبت میں ملکہ کی مدد کرنے کے بجائے وہ خود بھی نیپلز پر حملہ آور

ہوا۔ اور جو انا اس کے ہاتھ میں گرفتار ہو گئی۔ چارلس یہ جانتا تھا کہ جو انا اسی وقت تخت سے دست بردار ہو کر اُسے اپنا جانشین بنا دے۔ مگر اُس کی اس حرکت سے جو انا راض ہو گئی۔ اور اُسے اپنی سلطنت نیبلز کی وراثت سے بھی محروم کر دیا۔ چارلس نے جو انا کو ایک قلعہ میں بند کر دیا۔ اور طرح طرح کی تکلیفیں دینا شروع کیں۔ تاکہ وہ مجبور ہو کر تخت سے دست بردار ہی پر مجبور ہو جائے۔ مگر جو انا نے کسی طرح نہ مانا۔ اسی قید خانے میں جو انا سو رہی تھی کہ ایک رات کو اس قدر کڑے اور تکیے اس کے سونہ پر رکھ کے دبائے گئے کہ اُس کی سانس رک گئی۔ اور اُس کا دم نکل گیا۔ اُس انفس ناک طریقے سے اس میش و عشرت کی ولادہ حسین ملکہ کا ۳۸۲ء میں خاتمہ ہو گیا۔

نجران کے یہودی نصاریٰ کا انجام

سلمہ بن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن ولید کو تھوڑا لشکر دے کے بنی حارث بن کعب کی جانب روانہ کیا۔ یہ قبلہ علاقہ نجران میں رہتا تھا۔ جس میں زیادہ تر یہودی اور کچھ مسیحی تھے۔ رسول اللہ صلعم نے حضرت خالد کو یہ حکم دیا کہ وہ ان پوچھ کر نہ آواز بلند تین دفعہ ان کو دعوت اسلام دینا۔ اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو تم خود انھیں لوگوں میں پھیر جانا۔ اور انھیں اسلام کی تعلیم دینا۔ لیکن اگر وہ اسلام نہ قبول کریں تو ان سے مقابلہ کرنا۔ ازان رسالت کی تعمیل میں حضرت خالد بن ولید وہاں پہنچے دعوت اسلام دی۔ جسے یہودیوں نے بخوشی قبول کر لیا۔ اور اسلام لائے خالد انھیں میں ٹھہر گئے۔ اور رسول مقبول (صلعم) کو ان کے اسلام قبول کرنے کی اطلاع کر دی۔

چند روز بعد حضرت خالد وہاں سے واپس چلے۔ تو بنی حارث کا ایک وفد ان کے ساتھ ہوا۔ یہ لوگ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے۔ اور چند روز بعد واپس گئے۔ رسول اللہ (صلعم) نے عمر بن حزم کو ان لوگوں

میں بھیجا کہ شریعت اسلام کی تعلیم دین۔ اور اُن سے صدقات کی رقم وصول کیا کریں۔ غرض کہ حرم وہیں تھے۔ اور اپنی مفوضہ خدمت انجام دے رہے تھے کہ رسول اللہ صلعم نے سفر آخرت فرمایا۔

لیکن نجران کے عیسائیوں کا یہ واقعہ ہے کہ اُنھوں نے عاقب اور سید نام اپنے دو شخصوں کو اور چند لوگوں کے ساتھ بارگاہ نبوی میں بھیج کر آپ سے مباہلہ کرنا چاہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی مرتضیٰ فاطمہ زہرا اور تحنین علیہم السلام کو ساتھ لے کر مباہلے کے لیے نکلے۔ اُن لوگوں نے آپ کے ان نورانی چہروں کو دیکھا تو آپس میں کہنے لگے کہ یہ تو ایسی صورتیں ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کو قسم دلائیں تو وہ ہمارے دونوں کو بھی ان کی جگہ سے ہٹا دے اور اُن کے دلوں پر ایسا رعب طاری ہوا کہ مباہلے کی جرأت نہ ہوئی۔ اور اس اقرار پر صلح کر لی کہ ہر سال دو ہزار ٹھٹھے بھیجا کریں گے۔ ان میں سے ہر ٹھٹھے کی قیمت چالیس درہم ہو کرے گی۔ اس کے علاوہ رسول اللہ صلعم کے بھیجے ہوئے لوگوں کی ہمان دار بھی اُنھیں کے ذمے ہوئی۔ اس کے معاوضے میں اُن سے وعدہ کیا گیا کہ اُنھیں اپنے مذہب پر قائم رہنے کی اجازت دی جائے گی اور اس بنا پر اُن کے ساتھ کسی قسم کی سختی نہ کی جائے گی۔

آپ کے بعد حضرت ابو جبر صدیق رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا۔ اُس میں بھی اُن لوگوں کے ساتھ یہی برتاؤ رہا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں نجران کے مسیحیوں کی تعداد بڑھتے بڑھتے چالیس ہزار کو پہنچ گئی۔ اس زیادتی کی وجہ سے آپس میں ہی رفاقتیں پیدا ہو گئیں اور یہاں تک حسد بڑھا کہ اُن کے سر پر آور وہ لوگ خود ہی حضرت عمر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ آپ ہمیں کہیں اور بھیج دیجئے۔ حضرت عمر کو اُن کی کثرت کی وجہ سے مسلمانوں کے حق میں اندیشہ نظر آتا تھا۔ اُن کی اس درخواست کو غنیمت جانا۔ فوراً اُن کی کل جائیداد اور مال و اسباب کی قیمت ادا کر دی۔ اور اُنھیں شام اور حوالی کو ذمہ من جگہ دی۔ جلا وطن ہونے پر بھی وہ مقررہ خراج برابر ادا کرتے رہے۔

حضرت عثمانؓ نے اس خراج میں دو سو حُلّوں کی تخفیف کر دی جب حضرت علیؓ کا زمانہ آیا اور آپ نے کونے کی سکونت اختیار کی تو وہ لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے وطن واپس جانے کی اجازت چاہی حضرت علیؓ نے فرمایا کہ عمرؓ نے جو کچھ کیا مناسب کیا۔ میں اس کے خلاف کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔

اس کے بعد حضرت معاویہؓ اور یزید بن معاویہ کا زمانہ ہوا تو ان کے رباروں میں جا کے ان لوگوں نے یہ ظاہر کیا کہ ہماری جماعت منتشر ہو گئی۔ ہم سب بہت سے مسلمان ہو گئے۔ اور بہت سے مر گئے۔ یہ واقعہ تھا کہ اب ان کی تعداد بہت گھٹ گئی تھی لہذا یزید نے دو سو حُلّے اور گھٹا دیے۔

عبدالملک بن مروان کے عہد حکومت میں حجاج والی عراقی ہوا عبدالرحمن بن محمد بن اشعث نے اس کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ بد قسمتی سے بخراہنہ نے بھی عبدالرحمن کا ساتھ دیا تھا۔ اس الزام میں سزا کے طور پر ان کے ذمے تیرہ سو حُلّے بڑھا دیے گئے۔

اب عمر بن عبدالعزیز کا زمانہ آیا۔ یہ لوگ شکایت لے کے اس کے دربار میں پہنچے اور عرض کیا کہ ہم منے کے قریب پہنچ گئے ہیں مگر اس پر بھی یہ آفت ہر کہ بددی عرب ہمیں لوٹا کرتے ہیں۔ اور حجاج نے یہ ظلم کیا کہ خراج کی مقدار ناقابل برداشت کر دی۔ عمر بن عبدالعزیز نے حکم دیا کہ ان لوگوں کی مردم شماری کی جائے۔ گئے گئے تو پہلے کی نسبت اب ان کی تعداد صرف دسواں حصہ گئی تھی۔ یہ معلوم ہو گیا تو اس نے کہا کہ میں اس خراج کو جو یہ سمجھتا ہوں۔ ان کی زمین پر کوئی محصول نہیں ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جو کافر مسلمان ہو جائے یا مر جائے اس پر سے جزیہ ساقط ہو جاتا ہے۔ لہذا اس نے تحقیق کر کے صرف دو سو حُلّوں کا خراج ان کے ذمے باقی رکھا۔



اقیشتر ایک مشہور شاعر گزرا ہے۔ غالباً عہد جاہلیت میں پیدا ہوا اور آفا ز اسلام میں اس کا نشو و نما ہوا۔ اس کا اصلی نام تغیر بن عبد اللہ تھا۔ اور کنیت (أو معرض بنی) اقیشر اقرش کی تصغیر ہے جس کے معنی سرخ کے ہیں۔ اس کا چہرہ سرخی مائل تھا۔ لہذا لقب اقیشر مشہور ہو گیا جس سے وہ بلا امتنا اور اگر کوئی اقیشر کہہ کے پکارنا تو بہت ناراض ہوتا۔

اقیشتر نے ایک طولانی عمر پائی اور بنی اسد میں بہت اچھا نسب رکھتا تھا۔ سماک بن مخزومہ اسدی نے کوفہ میں مسجد سماک کو حضرت عمر فاروق کے عہد میں تعمیر کیا۔ سماک شیخان عثمان میں تھا۔ اور اس محلے والے اب تک اسی گروہ میں چلے آتے ہیں۔ اہل کوفہ کا بیان تھا کہ حضرت علی نے اس مسجد میں کبھی نماز نہیں پڑھی۔ اور کوفہ والے اب بھی اس مسجد میں جانے سے احتراز کرتے ہیں۔ اقیشر اسی سماک کا رشتہ دار تھا۔ اور اس نے اس مسجد کے متعلق کچھ اشعار کہے تھے۔ یہ مسجد سماک کو بنے میں بنی اسد کی سب سے بڑی مسجد بنی۔ اقیشر نے اس مسجد کے متعلق جو اشعار کہے تھے ان کا مطلب یہ تھا کہ بنی دووان ہماری مسجد سے ناراض ہیں۔ اور انھیں اس پر غصہ آتا ہے حالانکہ یہی مسجد ان کی شہرت کا ذریعہ ہے۔ اگر کل ہم اُسے دُعا دیں تو ان کا نام ہمیشہ کے لیے مٹ جائے گا۔ اُن کا نام اُسی سے ہے اور وہ اس کے پڑوس میں رہتے ہیں۔ اس کا نام ہمیشہ بنی اسد سے وابستہ رہے گا۔ بنی دووان جب اس میں نماز پڑھیں

تو آدھا ثواب ہم بٹالین گے اس لیے کہ فی مصلیٰ آدھا اجر مسجد کے حصے کا ہے۔
یہ اشعار سنتے ہی بنی دودان قسم کھا گئے کہ ہم اسے بغیر اسے نہ رہیں گے۔ یہ سن
کر اقیشران کے پاس گیا اور کمالین نے ایک شعر ایسا کہہ دیا ہے کہ اس کی ساری
خوابیاں مٹا دی ہیں۔ اور اب تمہیں ناراض ہونے کی کوئی وجہ نہیں انھوں
نے کہا کجوقت تو نے کیا کہا ہے سنا آپ نے ایک شعر پڑھا جس کا مضمون یہ تھا
کہ بنی دودان سرداروں کا قبیلہ ہے اور شرافت و کثرت تعداد ان کا حصہ ہے۔
یہ سن کے وہ لوگ خوش ہو گئے اور اپنے ارادہ سے باز آئے۔

اقیشر کو سننے کا رہنے والا تھا۔ مگر ساری عمر بنی برادری سے الگ رہے
عزت اور دائم الخمر رہا۔ چنانچہ خود اپنی تعریف میں کہتا ہے کہ آؤ معرض بہترین شہزاد
پیتا ہے اور اس کے پینے کے بعد عقل خطیب بن جاتا ہے۔ لیکن اگر نشے نے کمی
کی تو غیر بغیر یہ نہیں رہا جاتا۔ آؤ معرض حرام کو حلال کر لیتا ہے۔ اور قبیلے کی
برادری سے باہر ہے۔ وہ بڑوں کی تعریف کرتا ہے اچھوں کی خدمت کیا کرتا ہے
اور چاہے وہ لوگ اسے درگزر کر دیں۔ مگر آؤ معرض کبھی درگزر نہیں کر سکتا۔
ایک دن اقیشر مقام دیر جہ میں سے گزر رہا تھا۔ راستے میں ایک
مقام تھا جان قبیلہ بنی عبس کے لوگ بیٹھ کے آپس میں باتیں کیا کرتے تھے۔ گو با
وہ ان کا کلب تھا۔ نہ بیان صحبت میں سے ایک نے چھڑنے کے لیے اس کا نام
لے کے پکارا مشہور تھا کہ جب کوئی شخص اس کا نام لے کے پکارتا ہے تو اسے
غصہ آ جاتا ہے۔ معزین قبیلہ میں سے بعض لوگوں نے اسے پکارنے والے کو
منع کیا اور جھڑک دیا۔ مگر اقیشر بغیر جواب دیے آگے بڑھا چلا گیا۔ پھر ایک شخص کو
ساتھ لیا۔ اس کو سکھا دیا کہ تم میرے ساتھ رہو۔ جب میں کوئی شعر پڑھوں تو تم
اس کے بعد سوال کر دیا کہ وہ کیوں؟ اس کے معاوضے میں تمہیں دودرہم
دون گا۔ اس شخص کو ساتھ لے کے اسی بیٹھکے کی جانب واپس آیا۔ پاس کھڑے
ہو کے ایک ایک کو بڑے غور سے دیکھا اور اس نوجوان کو پہچان لیا جس نے
اسے پکارا تھا۔ اس کی طرف متوجہ ہو کے ایک شعر پڑھا جس کا مطلب یہ تھا۔
کہ تو مجھے اقیشر کہہ کے پکارتا ہے۔ یہ تو میرا نام ہی ہے۔ مگر میں تجھے جہاز مجاہد

کا بیٹا کہہ کے پکاروں گا ساتھ والے شخص نے حسب قرار داد پوچھا کیوں؟ اس کے جواب میں ایک اور شعر پڑھا جس کا مطلب یہ تھا کہ رات کے وقت اپنے یار کو چپکے سے بلاتی ہو اور کوئی نہیں جانتا کہ کیوں بلاتی ہے۔ یہ شعر اس قدر مشہور ہوا کہ اسی دن سے اس نوجوان کا لقب "ابن مطفیۃ السراج" یعنی "جراغ بجھانے والی کا بیٹا ہو گیا۔

ابو المصنار نام ایک شخص تھا جو خجرون کو کرایہ پر چلاتا تھا۔ اقبشر کا معمول تھا کہ اس کا خچر کرایہ کر کے قہرہ کے مے فروشوں کے پاس جایا کرتا۔ یونین ایک دن ابو المصنار کے پاس آیا کہ اُس کے خچر کرایہ کرے۔ اتفاق سے اس وقت وہاں ایک نیمبی شخص بیٹھا ہوا تھا اقبشر کے جانے بعد اس نے پوچھا کہ یہ کون ہے ابو المصنار نے کہا اقبشر اس نیمبی نے یہ سنتے ہی ادھر ادھر نظر دوڑائی سامنے ایک ترازو پڑی تھی اسی کو اٹھایا اور ایک پڑے پر لیکر شعر پڑھ دیا جس میں اقبشر اور اس کے قبیلے کی نسبت تھی اور کہا جب اقبشر نے تو اسے شعر پڑھ کر دکھا پھر گنا چا پھر جب اقبشر کو ابو المصنار نے کہا پڑے پر جو کچھ لکھا ہوا ہے اس کو زرا پڑھ لیجئے۔ اقبشر نے اس شعر کے نیچے اپنے دو شعر اس نیمبی شخص کی تجویز میں لکھ دیے۔ اس کے بعد جب نیمبی آیا تو اُس کو وہ شعر دکھائے گئے۔ اس نے ان دونوں شعروں کے نیچے ایک اپنا شعر اور لکھ دیا۔ اور پہلے سے زیادہ ہجو کی۔ ابکی جو اقبشر نے پڑھا تو کہا کہ یہ یوں نہ اُتے گا۔ اور چھ سات شعروں میں اپنے شخص طریقے سے اس کی خدمت کی اور ایسی خبری کہ وہ پڑھ کے بیتاب ہو گیا۔ کچھ جواب توں نہ پڑا مگر اپنی قوم والوں میں دوڑا گیا اور بہت سے تمیمیوں کو ساتھ لے کے پہونچا کہ اقبشر کی خوب مرمت کرے۔ لیکن اور بہت سے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور پھر یمن پڑ کے صلح کرادی۔

عبد الملک بن مروان کے سامنے اقبشر کے بعض اشعار گائے گئے جو کہ گویا ابن طلحہ کی مدح میں تھے۔ عبد الملک اُنھیں سنتے ہی بیتاب ہو گیا۔ کینز سے پوچھا یہ اشعار کس کے ہیں۔ بولی اقبشر کے۔ یہ سن کے عبد الملک نے کہا جو مدح بغیر لائق کیے جائے ایسی ہی موثر ہوتی ہے۔ یہ بالکل مطابق واقعہ ہے۔ مرفوف فرق نہیں اور اس وقت سب سے بڑا شاعر اقبشر ہے۔

ایک سفر میں اقبشر اور کینت بن زباد کا ساتھ ہوا۔ کینت نے پوچھا ابو مصنار (اقبشر کی کنیت) کہاں کا ارادہ ہے۔ اقبشر نے نظم میں جواب دیا۔ ان اشعار کو سن کے

کمیت کا یہ حال ہوا کہ بار بار پڑھواتا اور خود پڑھتا تھا۔ مگر جی نہ بھرتا تھا۔ آخر میں کہنے لگا کہ جس کسی نے تھین سب سے بڑا شاعر بنایا وہ جھوٹا مہین ہے۔

زیادہ عصفری کی بیٹی مرگئی جنارے کی شایعیت میں اور دن کے ساتھ اقیشر بھی گیا۔ اُسے دفن کر کے واپس آ رہا تھا کہ عابس نام ایک غلام ملا۔ اُس نے پوچھا کچھ کھانے پینے کا بھی جی چاہتا ہے۔ کہا بیشک عابس ان کو اپنے گھر لے گیا۔ کھانا اور شراب پلائی۔ جب ذرا سرور ہوا تو آپ نے برجستہ دو شعر پڑھے۔ جن کا مطلب یہ تھا کہ خدا کرے زیادہ کی بیبیان روز مرا کرین اور عابس یونین روز دعوت کیا کرے یاس کے بعد امید اور آرزو کی تصویر آج ہی نظر آئی۔

ایک دن حیرہ کے ایک سے فروش کے ہاں اقیشر نے خوب پی۔ مگر پی ہی رہے تھے کہ محنت کے آدمی آپونے۔ اقیشر بھاگ کے گھر کے اندر گھس گیا۔ اور دروازہ بند کر کے چلا یا کہ میں تو شراب نہیں پی رہا تھا۔ مجھے پکڑنے کی کیا وجہ ہے۔ انھوں نے کہا ہم نے تھین جام ہاتھ میں لیے اور اس کو منہ سے لگا کے پیتے دیکھا ہے۔ کہا تم نے دیکھا تو ضرور مگر میں اس گھروالے کی اونٹنی کا دودھ پی رہا تھا۔ انھوں نے کہا ہم ہرگز نہ مہین گے۔ آخر یہ ہزار خرابی دودھ میں لے کے ملے۔ آپ نے برجستہ تین شعر کہے جن کا اصل یہ تھا کہ ہمارے پینے کا دودھ بوتل میں بھرا ہوا ہے اور اس میں پانی کی آبریزش کر دیجئے تو اور اچھا ہو جاتا ہے۔ یہ زعفرانی دودھ ہے جس کی رنگت خوب صاف ہے۔ سخت گناہ کے بوا سیر کا علاج ہے۔ ہم تو اپنا روپیہ صرف کر کے پیتے ہیں۔ محنت کا دیون سے کہو کہ یہ کیا اندھیر چار کھا ہے۔

ایک مرتبہ قبیلہ بنی اسد کے چند کلا عبد الملک بن مروان کے دربار میں حاضر ہوئے۔ اس نے پوچھا بتاؤ تمہارا شاعر کون ہے۔ انھوں نے کہا میں بہت سے شاعر ہیں مگر لوگ یہ پسند نہیں کرتے کہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دین عبد الملک نے کہا اچھا بتاؤ اقیشر کیسا ہے؟ جواب دیا وہ تو مر گیا۔ عبد الملک نے کہا مہین وہ تو آج تک اپنی عشق بازیوں پر مصروف ہے اُس کے بعد اگر تم میں کوئی شاعری کرے گا تو اپنی اوقات ضائع کرے گا۔ یہ کہہ کے عبد الملک نے اقیشر کے تین شعر پڑھے اور کہا دیکھو شعرا سے کہتے ہیں۔ اقیشر کے پڑوس میں ایک آئے دالار ہتا تھا جو لین دین کرتا تھا۔ اب تو انکے

اس کی کنیت تھی اقبشر نے اس کے پاس جا کے کچھ مانگا۔ اس نے ونے سے انکار کیا۔ آپ نے آتے ہی اس کی چوبین دو شرکہ ڈالنے جن کو سنتے ہی وہ گھر کے دوڑ آیا۔ جو کچھ انھوں نے مانگا تھا پیش کر دیا اور کہا مہتاب ان شرکوں کے بعد اور کوئی شر آپ نہ فرمائیے گا۔

ایک اعرابی جو بنی تمیم بن سے تھا اکثر اقبشر کے ساتھ سفر کیا کرتا تھا اس نے ان کی مخالفت میں چند شعر بھی کہے۔ سن کے انھوں نے پوچھا تو کس قبیلے میں سے ہو اُس نے بتایا کہ میں بنی تمیم میں ہوں۔ اقبشر نے فوراً اسی قافیہ میں اُس کی جو کھی جس کا اثر یہ ہوا کہ معرزمین بنی تمیم ان کے پاس دوڑے آئے۔ معذرت خواہ ہوئے اور ان زبان درازیوں سے اُنھیں روکا۔

ایک مرتبہ اقبشر نے قبرہ کے ایک مقام میں شراب پی۔ وہاں ایک درزی بھیج کے سیاکر رہا تھا۔ اس کے پاس ایک اندھا بیٹھا ہوا تھا اور ایک مغنی کچھ گار رہا تھا۔ اقبشر اس کے نغمے سے اس قدر خوش ہوا کہ اپنے پاس سے اُسے شراب پلائی جب سب کا شر زور دن پڑ ہوا تو اندھا اٹھ کے دوڑنے لگا۔ اور درزی بیٹھے بیٹھے ناچنے لگا۔ اقبشر نے برجستہ چند ایسے اشعار کہے جو نہایت ہی لطیف تھے اور چند ہی روز میں ہر جگہ مشہور ہو گئے۔

اقبشر کے بہان ہمیشہ شراب کا دور چلتا رہتا۔ اور ندیان محبت جمع ہونے۔ حجاج نے سنا تو اس محبت کے بعض لوگوں کو پکڑ بلا یا۔ محبت درہم و برہم ہو گئی بعض بھاگ کھڑے ہوئے۔ بعض مر گئے۔ اور بعضوں نے توبہ کر لی۔ اس واقعہ کو بھی اقبشر نے اپنی ایک نظم میں نہایت لطف سے ظاہر کیا ہے۔

اقبشر کا معمول تھا کہ پانچ درہم سے زیادہ کسی سے نہ مانگتا۔ ان میں سے دو درہم خیر کے کرائے میں صرف ہوتے۔ دو میں شراب اڑتی۔ اور ایک سے کھا پینا اس سے پہلے بنایا جا چکا ہے کہ اقبشر کے پڑوس میں ابوالمضار نام ایک شخص رہتا تھا۔ جس کے خیر کرایہ پر چلتے تھے۔ اقبشر دو درہم دے کے اس سے خیر لیتا۔ سوار ہو کے قبرہ میں پہنچتا۔ کھوار کے گھر میں پہنچ کے خیر کو کسی درخت میں باندھ دیتا۔ اور بیٹھ کے پیتے پیتے شام کر دیتا۔ شام کو اسی خیر پر سوار ہو کے گھر واپس آتا۔ لوگوں میں مشہور

تھا کہ اقبیسر نے اس بچہ کا اتنا کرایہ دیا کہ اس کی قیمت سے زیادہ ادا کر دیا۔ اس بچہ کی طرٹ
مخاطب ہو کے اُس نے ایک نظم بھی کہی ہے جس میں اپنی سیکشی کی شان دکھائی ہے۔
معمول کے مطابق ایک دن حیرہ بین کلوآر کے گھر ہو چکا تو اس کا پتہ نہ تھا۔
بیٹھ کے انتظار کرنے لگا۔ اتنے میں بنی عمار کی ایک عورت اس مکان میں آئی اقبیسر
نے پوچھا مے فروش کہاں گیا۔ وہ بولی کسی کام کو گیا ہے۔ میں اس کی بوی ہوں
تم کیا چاہتے ہو۔ کہا بنید (ایک قسم کی شراب) چاہیے۔ اس نے پوچھا کتنے کی کہا
دو در ہوں کی۔ وہ بولی لاؤ۔ درہم لاؤ۔ میں لائے دیتی ہوں۔ اُنھوں نے درہم
دیدے۔ مگر وہ بنید لینے چلی تو احتیاط کے لیے خود بھی اُس کے پیچھے ہڑیلے۔
آخر جاتے جاتے وہ ایسے مکان میں داخل ہوئی جس کے دو دروازے تھے۔
یہ اس مکان میں ایک جگہ بیٹھ رہ گئے۔ اور وہ دوسرے دروازے سے نکل کے
غائب ہو گئی۔ اُنھیں جب بیٹھے بیٹھے دیر ہوئی تو ان گھر والوں میں سے ایک
شخص قریب آیا اور پوچھا کیوں بیٹھے ہو۔ اُنھوں نے ساری سرگوشٹ بیان کی
اُس نے سن کے بڑا افسوس کیا اور کہا وہ تم کو دھوکا دے کے دوسرے دروازے
سے نکل گئی۔ یہ آم حنین نام ایک بڑی سکار عورت ہے جو بنی عمار میں سے ہے۔
اب آپ سمجھ کے میں فریب میں آ گیا۔ اس مکان سے نکل کے کلوآر کے پاس آئے
اس سے واقعہ بیان کیا اور کہا کہ اب آج تو مفت پلوآ کے مزارکے اور کل دام
دے دیدن لگا۔ اس نے بقدر ضرورت بنید پلا دی اور اُنھوں نے اپنے
دو در ہوں کے ماتم میں ایک نظم کہہ ڈالی۔ بعض راوی بیان کرتے ہیں کہ اس
کلوآر کا نام حنین تھا۔ اور اسی رعایت سے اُس سکار عورت نے اپنا نام آم حنین
بتا دیا۔ اس نظم میں اُنھوں نے آم حنین کا نام لے کے بل بھلا کہا تھا۔ لہذا جب حنین
کلوآر کے پاس بھڑ آئے تو اُس نے کہا کہ میرا کیا قصور تھا جو آپ نے میری اور
میری ماں کی ہجو کہہ ڈالی۔ آپ نے کہا کہ اُس سکار عورت نے مجھ سے دو در ہم
لے لیے اور شراب نہ دی۔ اس نے کہا خدا کی قسم میری ماں آپ کو بچا نیتی بھی
نہیں اور نہ اس نے کچھ آپ سے لیا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنی ماں کو بلالایا
اور کہا دیکھیں ان کو آپ نے درہم دیے ہیں یا کسی اور کو۔ آپ نے دیکھ کے

کہا میں انہیں کیا جانوں۔ میں نے تو آم جنین کو درہم دیے ہیں۔ اسے اور اُس کے بیٹے کو گالیاں دیتا ہوں۔ ام حنین اگر کوئی اور عورت ہے تو میری مراد اُس سے ہے۔ اور اگر بھاری ماں ہے تو وہی سہی۔ میں اسے کیا کروں۔ اس نے کہا یہ تو آپ کو معلوم ہو گیا کہ جس نے آپ کو دھوکا دیا وہ میری ماں نہ تھی۔ مگر اس بھوکا اثر تو مجھ پر اور ان پر بڑا بڑا ہے۔ جواب دیا تو کیا تم جانتے ہو کہ میرے یہ دو درہم یونین جانے رہیں گے؟ اس نے پریشان ہو کر کہا خدا تمہیں غارت کرے لو اپنے دو درہم مجھ سے لے لو اور بھی جو کچھ کو پورا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مگر میری جان چھوڑ دو۔

عربان بن ہنیم غنی اقیشر کا دوست تھا۔ اس نے کہا اقیشر میں شام کے ملک میں جانا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنے چند پُرطفا اشعار لکھوا دو۔ انھوں نے لکھوا دیے۔ وہ شام گیا بہت سی دولت حاصل کی اور ایک غلام کے ہاتھ پچاس درہم ان کے پاس بھجوائے۔ غلام نے اُس کے درہم انہیں دکھائے۔ اور کہا یہ پچاس درہم دیتا تو ہوں مگر اس شرط سے کہ آپ عربان کی ہجو کہہ دیجیے۔ اس لیے کہ حساب سے جتنا آپ کو ملنا چاہیے اتنا اُس نے نہیں دیا ہے۔ آپ نے بے تکلف عربان کی ہجو میں تین شعر اسی وقت کہہ دیے اور درہم لے لیے۔ اتفاق سے عربان کا باب ہنیم کو نے کا کہ تو ال تھا پہلے آپ کو اس کا خیال نہ آیا تھا۔ اب ان اشعار کا غلغلہ ہوا تو آپ ڈرے کر دیے کیا کرنا ہو۔ مگر ہنیم نے جب وہ اشعار سنے تو پانسو درہم ان کے پاس اور بھیج دیے اور درخواست کی کہ اللہ میرے بیٹے کی جان چھوڑے اور اب اُس کی ہجو نہ کہیے گا۔

حضرت کے ایک شخص نے جو کہنے میں رہتا تھا نبی اسد کی ایک عورت نکاح کا پیام دیا اور ادھر ادھر لوگوں سے اس عورت کا حسب نسب دریافت کرنے لگا۔ اقیشر کے پاس بھی آیا اور اُس عورت کی کیفیت پوچھی کیونکہ یہ بھی نبی اسد میں سے تھے۔ انھوں نے پوچھا تم کون ہو۔ اُس نے کہا میں حضرت موت کا رہنے والا ہوں۔ یہ سنتے ہی آپ نے دوشعر کہ جن کا مضمون یہ تھا کہ اہل حضرت موت ہمارا نسب دریافت کرنے میں حالانکہ ہمارا ہی نسب حضرت موتوں کے لیے مایہ ناز ہے۔ نہ رونا کے بھائی جن کے تمام بندر چچا ہیں۔ سب اہل عرب خدا سے بھی دعا کرتے ہیں کہ

تھاری قربانیت سے بری رہیں۔

اقیشتر سے ایک دن ان کی پھوپھی نے کہا کہ خدا سے ڈرو اور اٹھ کے ناز پڑھو۔ کہا ناز تو نہ پڑھوں گا۔ اس نے بار بار تاکید کی کہ نہیں پڑھنا ہوگی کہا تو اچھا دو باتوں میں سے ایک اختیار کر لو۔ یا تو ناز پڑھوں گا اور طہارت کروں گا۔ اور یا طہارت کروں گا تو ناز نہ پڑھوں گا۔ ان کی پھوپھی نے کہا کہ یہ شرطیں نازی میں تو بے وقعت ہی پڑھو۔ مگر پڑھو ضرور۔

ایک دن حیرہ والے سے فروش کے گھر میں آپ پی رہے تھے۔ ناگمان محبت کا ایک آدمی آگیا۔ آپ گھر کے مکان کے اندر گھس گئے۔ اور دروازہ بند کر لیا۔ اس نے چلا کے کہا اچھا تم شوق سے پیو مگر بنید کا ایک جام مجھے بھی پلو اور آپ نے کہا مجھے بخدا کھانا اعتبار نہیں۔ لیکن اس دروازے میں سوراخ موجود ہے۔ نیچے بیٹھ جاؤ میں ہمیں سے پلانے دیتا ہوں۔ وہ بیٹھ گیا اور آپ نے زرکلی کی ایک چوٹلی میں سے اُسے بنید پلائی بیان کیا وہ پیتے پیتے مدہوش ہو گیا۔ اس واقعے کو بھی آپ نے نظم کیا ہے۔

اقیشتر نے ایک دن محمد بن اشعث کے بیٹے قیس کے پاس جا کے جو نابینا لکھا کچھ مانگا۔ اُس نے اپنے داروغہ کو حکم دیا کہ انھیں تین سو درہم دیدے۔ آپ نے کہا مجھے اکٹھا نہ دیجیے۔ داروغہ صاحب سے کہہ دیجیے کہ مجھے تین درہم روزانہ دیدیا کریں۔ اُس نے بھی حکم دیدیا۔ اس کے بعد آپ روز داروغہ کے پاس جاتے اور تین درہم لے آتے جن میں سے ایک شرب پینے میں ایک کھانے میں اور ایک کرایہ میں صرف ہوتا۔ جب یہ رقم پوری صرف ہو گئی تو آپ نے پھر اُس سے سوال کیا۔ اُس نے پھر تین سو درہم اسی مد میں دلوا دیے۔ وہ رقم بھی صرف ہو گئی تو تیسری بار گئے اُس نے پھر وہی رقم دیدی اور پھر صرف ہو گئی۔ چوتھی بار پہنچے اور سوال کیا۔ اس نے بڑے کہا تم نے یہ اپنا خراج مقرر کر لیا ہے؟ جاؤ اب میں کچھ نہیں دیتا۔ آپ جو ش میں بھرے ہوئے دابیں چلے اور اُس کی جھک ڈالی۔ وہ اشعار جب قیس تک پہنچے تو اُس نے کہا ایشتر کی زبان سے دنیا میں کوئی اور بجا ہوتا تو میں بھی بجا جاتا۔

کوفہ کے بعض لوگوں میں ایک دن آلو بکڑا، قمر صبر اور عث عثمان علی کے بارے میں نزاع ہوئی اور جھگڑا کسی طرح طے نہ ہوتا تھا۔ آخر سب نے اس پر اتفاق

کیا کہ اس وقت جو کوئی پہلے سامنے آجائے اسی کو حکم قرار دین اور وہ جو فیصلہ کرے اُسے مان لیں۔ اگہان سامنے سے میان اقبشر صاحب دکھائی دے جوتے میں جھوٹے چلے آئے تھے۔ ان کی صورت دیکھتے ہی سب نے کہا دیکھیے حکم کیسا معقول ملا ہے۔ مگر چونکہ اسی پر فیصلہ ہو چکا تھا سب نے بڑھ کے کہا اب تو معرض ہم نے آپ کو حکم قرار دیا ہے۔ پوچھا کس بارے میں؟ لوگوں نے واقعہ بیان کیا۔ آپ ذرا رُک کے ادرااس کے بعد ہی سر اٹھا کے بن شر پڑھے جن کا مطلب یہ تھا کہ جب میں ہر روز پانچ نماز میں پڑھ لیتا ہوں تو خدا میرے گناہوں کو معاف کر دے گا۔ میں پروردگار عالم کا شریک کسی کو نہیں جانتا اور میں ایک ایسے حق کو پکڑے ہوں جس میں کوئی پوشیدہ چیز نہیں۔ راستے میں جو عمارتیں ملتی ہیں اگر میں اُنھیں نہ دیکھوں تو مجھے معاف کرو۔ اقبشر نے اپنے چچا کی بیٹی تر باب کے ساتھ چار ہزار یا بقول بعض دس ہزار درہم مہر پر نکاح کیا اور مہر کی رقم اگنے کے لیے اپنے قبیلہ والوں کے پاس آئے۔ مگر کسی نے کچھ نہ دیا تب ابن داس بعض کے پاس گئے جو ملک چین کا ایک زمیندار اور مجوسی مذہب کا تھا۔ اُس نے مہر کی پوری رقم دیدی۔ آپ نے خوش ہو کے چند شعر کہے جن کا مضمون یہ تھا۔ تر باب کا مہر ایک مجوسی نے ادا کیا اور اس پر ہامون اور چچا سب قربان ہیں۔ مجھے اس کا اقرار ہے کہ تو بڑا خوش اخلاق ہے۔ اور تیرا باپ کریم اور فیاض تھا۔ اور اس کا بھی مجھے اقرار ہے کہ تو سارے اہل دوزخ کا سردار ہے۔ قارون کے گڑھے میں تو اُس کا پڑوسی ہوا اور فرعون کا تیرا ساتھ ہو۔ مجوسی زمیندار نے جب یہ اشعار سُنے تو بہت بگڑا اور کہا کم بخت تو اپنے قبیلہ میں گیا۔ وہاں کسی نے تجھ کو کچھ نہ دیا۔ تب میرے پاس آیا۔ میں نے جس قدر رقم کی ضرورت تھی سب دیدی تو اس کا بدلہ بھی ہے کہ تیرے شعر اور تیری خواہش سے میں بھی نہ بچ سکا۔ جواب دیا کیا تم اس سے خوش نہیں ہو کہ میں نے تمہیں ابو جہل سے بھی بڑھانے کا دشا ہوں کے برابر بٹھا دیا۔

ایک دن اقبشر نے ایک کلوار کے پاس بیٹھ کے شراب پینا شروع کی۔ بیان تک کہ ایک پیسہ بھی باقی نہ رہا۔ تب آپ نے اپنے کپڑے اُتار کے سب کلوار کے حوالے کر دیے اور اُن کی قیمت کی بھی پی گئے۔ پھر رہنمائی چھانے کے لیے بھوسے کے ایک انبار میں گھس کے بیٹھ رہے۔ سر اوپر نہ کھلا تھا اور باقی سارا جسم اس کے اندر تھا۔

اتنے میں ایک شخص اپنی کوئی کھوئی ہوئی چیز دھونڈھتا آبا آپ نے بے اختیار دعا مانگنا شروع کی یا اللہ ہمیں بچاؤ اور اس شخص کا جو کچھ کھو گیا ہو مل جائے یہ دعا سن کے گھوار نے بھیجھلا کے کہا تمہارے پاس اب رہا ہی کیا ہے جس کو اللہ بچائے گا۔ بولے یہ بھروسہ نہیں ہے۔ اگر اسے کوئی لے لے تو سردی سے اکر لے کر مر جائون گا۔ اس پر مے فروش کو ہنسی آگئی۔ کپڑے ان کے حوالے کر دیے اور کہا بس اب تشریف لے جائیے جب بیسہ پاس ہو تو آئیے گا شراب کی قیمت میں آپ کے کپڑے میں پھر کبھی نہ لون گا۔

ایک دن آپ لٹنے میں درست جا رہے تھے رات نے میں ہیتم نام ایک شخص ملا جو کو توانی کے عہدہ پر مامور تھا۔ اس نے اپنے سامنے بلایا اور کہا تم نشہ میں ہو۔ کہا جی نہیں تو اس نے کہا اور یہ موندہ سے بولکیسی آرہی ہے کہا میں نے سب کھا یا تھا اس کی بول ہے۔ اس جواب پر وہ ہنس پڑا اور کہا اچھا نشہ میں نہیں ہو تو بتاؤ دن میں کے رکعتیں پڑھتے ہو۔ آپ نے برجستہ سات شعر پڑھے جن میں عجب لطف اور بے ترتیبی اور غلطی کے ساتھ دن بھر کی نماز میں اور رکعتیں بتائیں یہ سن کے ہیتم نے کہا جی ہاں آپ نے نماز میں بتا دیں۔ امتحان میں کامیاب ہوئے اور ٹھنڈے ٹھنڈے تشریف لے جائیے۔

ایک مرتبہ اقیشر خلیفہ عبدالملک بن مروان کے دربار میں پہنچ گئے۔ اس نے کہا شراب کے بارے میں اپنے کچھ اشعار سناؤ۔ آپ نے سنا لئے۔ عبدالملک نے داد دی اور کہا آج معرض خوب کہا ہے اور شراب کی ایسی چھی قرین کی ہے کہ مجھے معلوم ہوتا ہے تم نے پی ضرور ہے۔ کہنے لگا اور امیر المومنین آپ کے اس بیان جانے سے بہ خدا مجھے آپ پر بھی ہی شبہ ہوتا ہے۔

اقیشر کا معمول تھا کہ اپنے بعض دو لٹمنڈ بھائیوں کے پاس جا کے ابگ لایا کرتے۔ اسی معمول کے مطابق ایک شخص کے پاس گئے۔ اس نے پانسو درہم دیے۔ اُنھیں لے کے سیدھے شراب خانے میں پہنچے اور وہ درہم مے فروش کے پاس رکھوا کے کہا تو اسے میرے حساب میں جمع کر لو۔ اسی میں سے روز مجھے جتنی شراب انگوں دے دیا کرو۔ اب آپ کے کئی دوست

پیدا ہو گئے جن کو آپ روز پلواتے اور خود بھی پیا کرتے۔ وہ رقم ختم ہو گئی اس کے بعد دو دن تو یہ ہوا کہ اُن دوستوں نے اپنے پاس سے انھیں پلوا دی۔ مگر تیس دن جو انھیں دور سے آئے دیکھا تو اُن دوستوں نے سے فرودش سے کہا کہ ہم جاتے ہیں تمہارے کوٹھے پر بیٹھیں گے اقیشرہ میں پوچھے تو کہہ دینا وہ آج نہیں آئے۔ چنانچہ جیسے ہی اقیشرہ وہاں پہنچے اس نے کہا آج تمہارے دوست نہیں ہیں۔ آپ نے یہ دیکھ کے کہ کوئی پلوانے والا نہیں ہے اپنے کپڑے اتار کے اس کے سامنے ڈال دیے اور کہا لو انھیں رکھو اور جتنی مانگوں پلا دو۔ اس نے شراب دیدی اور آپ بیٹھ کے پینے لگے۔ آپ نے دوستوں کو کوٹھے پر جاتے دیکھ لیا تھا۔ جب اقیشرہ کا نشہ تیز ہوا تو آپ نے تین شرپڑے جن کا مضمون یہ تھا کہ دوستو جام پر جام پلاؤ بیان کیا کہ میں مدہوش ہو کے گر پڑوں اس لیے کہ میرے سر پر کوٹھے کے کمرے میں ایسے لوگ بیٹھے ہوئے ہیں جو آدمیوں کو فریب دیتے ہیں۔ وہاں بیٹھے خالص شراب تند پیتے ہیں۔ مگر کاری سے سر نہیں اٹھاتے۔ یہ شر جو اُن دوستوں کے کان میں پہنچے تو وہ بے اختیار ان کی خوشامد کرنے لگے اور زمین سے چلا کے کہا آؤ اقیشرہ آؤ۔ ادھر چڑھ آؤ یا کو تو ہم نیچے اتر آئیں۔ یہ سن کے اقیشرہ پر چڑھ گئے۔ اور اُن کی صحبت میں بیٹھ کے پینے پلانے لگے۔

اقیشرہ نے ایک مرتبہ تشریف مردان کی تعریف میں قصیدہ کہا اور اس کے پاس جا کے سنایا۔ اُس وقت وہاں امین بن خرم، یاسدی، بیٹھا ہوا تھا۔ بولا کلام تو بخدا بہت اچھا ہے مگر جس سینے سے نکلا ہے وہ باپاک ہے۔ اس کے جواب میں اقیشرہ نے ایک شعر پڑھا اور اپنے گھر واپس چلا آیا۔ پھر اپنے چچا کو بشر کے پاس بھیجا۔ وہ وہاں سے ایک ہزار درہم لے آیا اور اقیشرہ سے کہا خدائی قسم یہ رقم میں تمہارے ہاتھ میں نہ دوں گا۔ تم شراب و کباب میں اٹرا دو گے۔ پوچھا کہ پھر آپ کیا کیجیے گا۔ کہا تمہارے اور تمہارے بال بچوں کے کپڑے بنا دوں گا اور تمہارے لیے سالہ بھری غذا فراہم کر دوں گا۔ یہ سن کے اقیشرہ خاموش ہو رہا۔ مگر دوسرے دن غم و بشر کے پاس پہنچے اور ایک شعر پڑھا جس کا مطلب یہ تھا کہ ابو مردان (یہ بشر کی کینٹ تھی) کو جر کر دو کہ اُن کے دیے ہوئے انعام کو وہ شخص لے گیا جو میرے اثر و عیال میں نہیں داخل ہے۔ اس نے واقعہ پوچھا تو سالہ

ماجرایان کر دیا۔ بشر نے فوراً کو تو ال کو بھیج کے ان کے چچا کو بکڑ بلایا۔ اُن سے وہ ہزار درہم چھین کے اقیشر کے حوالے کر دیے اور کہا تو یہ خاص تمھارے لیے ہیں اور تمھارے بال بچوں کی خبر گیری کے ہم جدا گانہ متکفل ہیں۔

ایک مرتبہ اقیشر حیرہ کی ایک کلوارن کے پاس پہنچے جس کا نام دوم تھا۔ اس کے پاس جاکے بیٹھے اس سے بنڈ خرید کے پی اور اس کے بعد کھنے لگے کہ ابھی بلاؤ کہ تمھاری تعریف بھی ویسی ہی اچھی کر دن۔ اس نے منتخب شراب لاکے پیش کر دی۔ اُنھوں نے پی۔ بہت خوش ہوئے اور اس کی تعریف میں تین شعر کہہ دیے جن کا مضمون یہ تھا کہ دومہ تیرا شراب خانہ آباد رہے بیمار و ناتوان بھی آتا ہے تو تو اُسے اپنی شراب ہلا کے تازہ دم کرتی اور اس کے پیٹ میں شیطان رحیم کو بھونک دیتی ہے۔ دومہ اس پر بہت خوش ہوئی اور کہنے لگی نہ تو اس سے اچھی میری کوئی تعریف ہو سکتی ہے اور نہ اس سے زیادہ میں کسی تعریف خوش ہو سکتی ہوں۔ مطر نام ایک میمی شخص دالی کو فہ مقرر ہوا۔ جب وہ تقریر کرنے کے لیے منبر پر چڑھا تو اس کے چڑھتے ہی منبر ٹوٹ گیا اور وہ گر پڑا۔ اقیشر کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ برجستہ دو شعر پڑھے جن کا مضمون یہ تھا کہ ابھی تم منبر تمھارے لیے نہیں ہے اور اُسے تمھارے نیچے قرار نہیں آتا۔ تمھارے جسم تمام ممبروں کو ناگوار ہیں۔ بنی خزمہ کو بلاؤ کہ منبر کو زینت دیں۔

جنی محارب میں سے ایک شخص جس کا نام قرینہ بن یعقوب تھا اقیشر کے پاس سے ہو کے گذرا۔ اقیشر اس وقت اپنے قبیلے والوں یعنی جوانان بنی اسد میں بیٹھا ہوا تھا۔ اور اس شخص کو پہچانتا تھا۔ لوگوں نے پوچھا اس شخص کا نام کیا ہے؟ آپ نے نظم میں جواب دیا کہس میں اتنی طاقت ہے کہ اس کا نام لے اور بڑے بڑے عقلمند اس کا ذکر کرنے سے عاجز ہیں۔ لوگ ہنسنے اور کہا ماشاء اللہ نام بتانے میں کون سی دشواری ہے کہا ان کے نام و نسب اتنے بڑے ہیں کہ ایک دن میں ختم ہی نہیں ہو سکتے۔ کہو تو آج نام بتاؤں اور کل نسب بتا دوں گا۔ اُنھوں نے کہا آجھا آج نام بتاؤ۔ اُنھوں نے بتایا قرینہ۔ پاس بیٹھے ولید بن من سے کسی نے کہا قرینہ کا بیٹا؟ اقیشر نے کہا جی کتنے ہو۔ لیکن نام کا تلفظ ادا کرنے میں مجھے انی

دشواری پیش آئی کہ اسی میں الجھ کے رہ گیا تھا۔ یہ خبر قریطہ کو پہنچی تو اُس نے نظم میں جواب دیا اس لیے کہ وہ بھی شاعر تھا۔ اُسکے اشعار کا حاصل یہ تھا کہ تیری نشہ کی زبان پر بہہ نگرکاری کی چیزیں گراں ہوا ہی جاہیں۔ ان بدکاری کی باتیں نہیں تو تیری زبان خوب تیز چلتی۔ آفتش نے اس کے جواب میں اسی جہاد و رفاہ میں جو اشعار کہے ان میں یہ خیالی ظاہر کیا تھا کہ قریطہ کو خود تو بدکار و عورتوں کے گردون میں جاتے شرع نہیں آتی مگر مجھے یکنشی پر شرم دلاتا ہے حالانکہ میں تو جب تک زندہ ہوں بیمار ہوں گا۔ اور مر جاؤں گا تو بھی دل میں اس کا لپکا باقی رہے گا۔

ایک مرتبہ حارث بن عبداللہ بن ابی ربیعہ اہل شام کے مقابلے کے لیے فوج لے کر روانہ ہوا اور آفتش کو بھی اپنے ساتھ نہ بردستی پکڑے گیا کہ سو میں دلچسپی رہے گی۔ آپ کے پاس کوئی گھوڑا نہ تھا۔ ایک گدھے پر سوار ہو کے چلے۔ یہ لشکر شہر سور کے قریب پل سے پار ہوا تو قریب ہی ایک گاؤں ملا جس کا نام قنیں تھا۔ وہاں ساتھ ہون کی آنکھ بچا کے آپ ایک سے فروش کی دکان میں گھس گئے۔ یہ سے فروش تبلیغی تھا۔ خود شراب چیتا تھا اور اُس کی عورت بدکاری کے ذریعے سے روپیہ پیدا کرتی تھی۔ آپ وہیں چھپ رہے جب لشکر روانہ ہو گیا تو گدھا بیچ ڈالا اور یکنشی و عیاشی میں مشغول ہو گئے۔ وہ لشکر ہم پوری کر کے واپس آیا تو آپ ایک بہت بڑا قصیدہ پڑھتے ہوئے اس کے سامنے نمودار ہوئے جس میں بیان کے اپنے سارے کازاتے بیان کیے تھے۔

ہارون رشید نے ایک رات کو کسی شخص کے گانے کی آواز سنی جو چار شعر گارہا تھا۔ ان کا معنی یہ تھا کہ اگرچہ شراب کم ہو گئی اور منع کر دی گئی ہے اور اسلام اس کے درمیان میں حائل ہو گیا ہے مگر میں روز صبح کو خالص شراب پیتا ہوں اور مرضی دل کا اس سے علاج کرتا ہوں کبھی خالص پیتا ہوں۔ کبھی پانی ملا لیتا ہوں۔ اور میرے سامنے کھڑے ہو کے مغنیہ عجب ناز و انداز سے گٹ کر رہی بھرتی اور آواز کے نشیب و فراز سے مجھے محو کر دیتی ہے۔ ہارون رشید کو یہ اشعار اور اس کی دھن ایسی اچھی معلوم ہوئی کہ لوگوں کو دوڑا یا کہ اس شخص کو بلالاد۔ لوگ اسے لے آئے مگر وہ سامنے کھڑا رہے دہشت کے کانپ رہا تھا۔ رشید نے کہا ڈرو

نہیں۔ مجھے تمھاری آواز بہت اچھی معلوم ہوئی۔ اس نے کہا خدا کی قسم اگر مومنین میں نے ان اشعار کو اس لیے گایا کہ شراب پینے سے توبہ کر لی ہے۔ یہ اشعار اقیشر کے ہیں۔ اور اس نے بھی شراب سے توبہ کرتے وقت لکے تھے۔ رشید نے پوچھا تم نے چھوڑ کیوں دی۔ جواب دیا۔ خدا کے خون سے اور اس کے بعد شراب کی ندمت میں چند شعر پڑھے۔ رشید نے کہا مجھے اس سے بحث نہیں ہے کہ تم شراب پیتے ہو یا چھوڑ دی ہے جو جی چاہے کر دو۔ مگر یہ نعمت خدا پر سناؤ۔ اس نے دوبارہ وہ اشعار گائے۔ رشید کو اس قدر بھلے معلوم ہوئے کہ اپنے مغنیوں کو بلوایا۔ اور ان کے سامنے اس شخص سے گواہی لے لیا کہ اس دھن کو یاد کر لو۔ اس کے بعد اس شخص کو انعام دے کر رخصت کر دیا۔ مگر یہ دھن خود رشید کے گھر میں اس قدر آت گئی تھی کہ چند روز تک معمولی باتیں کرتا تو آواز میں اسی دھن کی جھلک پائی جاتی۔

لو لو

خواب و خیال

۱۔ انجمن ترقی اردو کا مقصد جب تک ہمارا صوبہ رہا وہ بالکل گنناہی کی حالت میں رہی اور زبان کی بہت کم خدمت کر سکی۔ مگر جب سے ہمارے کرم و عظم جناب مولوی عبدالحق صاحب کے ہاتھ میں گئی اور اس کا مرکز اور گنگا دکن قرار پایا اس کی ترقی شروع ہوئی اور اس کے ذریعہ سے اردو کا ادبی خزانہ مفید تصانیف سے مالا مال ہو رہا ہے۔ اردو کی تادیر الوجود کتابیں خواب و خیال ہوئی جاتی ہیں اور ان کا تیرہ بھی نہیں چلتا کہ کیا ہوئیں۔ یہ مثنوی بھی اسی قسم کی کتابوں میں تھی۔ یہ صرف انجمن ترقی اردو کی کوشش و کاوش کا نتیجہ ہے کہ دستبرد زمانہ سے محفوظ کرنے کے لیے چھاپ کر شائع کر دی گئی ہے۔ یہ مثنوی حضرت خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی خواجہ سید محمد میر درد کی تصنیف ہے۔ انجمن ترقی اردو نے بڑا کام کیا کہ اسے اپنے ٹائپ کے مطبع میں نہایت صاف اور خوشنما چھاپ کے شائع کر دیا۔ اس مثنوی میں کوئی قصہ نہیں نظم کیا گیا ہے۔ بلکہ جذبات عشق اور

دار و اوت قلبی کو ایسی سیس خستہ اور بے تکلف زبان میں ادا کیا ہے کہ کوئی اور
 شغوی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس کا ہر شعر جذبات کے اثر میں ڈوبا ہوا ہے
 ایک مقام سے چند اشعار بلا کسی خاص انتخاب کے نقل کیے جاتے ہیں جن سے
 میراث کے کلام کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا۔

یاد ہیں جو کیے تھے قول دستارہ تمہیں کیا کھائیں تھیں ہزار دن بار
 عہد و پیمان ہوئے تھے آپس میں دوستی کی ہوئی تھیں سب رہیں
 کہنا تیرا وعدہ کر باہم تو بنا ہے گا دیکھیں گے اہم
 کس قدر ارتباط کرتے تھے گرمی اختلاط کرتے تھے
 ایک دم بھی جدا نہ ہوتے تھے ساتھ کھاتے تھے ساتھ سوتے تھے
 غیر کو وہ ان کمان گزرا ہوا تھا اور کا مونا کب گوارا تھا
 شغوی کے شریع میں جناب مولوی عبدالحی صاحب بی اے آنریری سکریٹری
 انجمن ترقی اردو کا ایک نہایت قابلانہ مقدمہ پڑھنے کے قابل ہے۔
 ہمیں امید ہے کہ لوگ اس کتاب کو ذوق و شوق سے منگوائیں گے۔
 ملنے کا پتہ۔ انجمن ترقی اردو۔ اورنگ آباد دکن قیمت فی جلد جلد ڈیڑھ روپیہ اور
 غیر جلد ایک روپیہ۔

ستوتی دنیائے اردو میں علامہ راشد الخیریؒ کے کون و اوقت نہیں۔ یہ انھیں کی تصنیف
 ہے۔ اور اسی رنگ میں جو ان کے لیے مخصوص ہے۔ قصہ دلچسپ اور موثر
 ہے۔ شائقین زبان اردو ضرور منگوائے پڑھیں۔ قیمت فی جلد آٹھ آنہ
 ملنے کا پتہ۔ منجر صاحب رسالہ عصمت۔ دلی۔

سرور عالم۔ مؤلف مولوی سید عبدالحی صاحب ناظم دارالتصانیف پکورتعلہ
 یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مختصر سوانحی کہتہ۔ مؤلف صاحب تحریر
 فرماتے ہیں کہ یہ امر اس کتاب کی بلیغ کا محرک ہوا کہ مردہ مولودوں میں ایسے
 خلاف عقل و قیاس واقعات بیان کیے جاتے ہیں جن سے شریعت اور سمجھدار

آدمی ایسی محفلوں سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ اس خوابی کو دور کرنے کے لیے مولف نے یہ مولود شریف مرتب فرمایا ہے جس میں نہایت مستند عربی فارسی انگریزی اور اردو کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔ اور جناب رسالت آب صلعم کے کل واقعات مختصر طور پر آگئے ہیں۔ اس کتاب میں بلا و عرب کا نقشہ اور کوہ حرا کا فوٹو بھی دیا گیا ہے۔ کاغذ کھائی اور چھپوائی ابھی ہر قیمت فی جلد بارہ آنہ مصنف صاحب منگوائی جائے۔

خیابان یہ ماہانہ رسالہ خاص ہمارے شہر سے بڑی خوبی کے ساتھ نکلنا شروع ہوا ہے۔ اس کے ایڈیٹر ہمارے دوست شہنشاہ حسین صاحب رضوی ایم اے ایس ایل بی (علیگ) ہیں۔ لکھنؤ کسی زمانے میں لکھنؤ کی کھائی اور چھپائی کے لیے مشہور تھا۔ مگر اب نہ تو ویسے لکھنے والے رہے ہیں اور نہ چھاپنے والے۔ تاجرانہ کفایت شعاری نے سب کو مٹا دیا۔ اور ہمیں یہ خیال پیدا ہو چلا تھا کہ چاہے ہزار کوشش کی جائے مگر اب لکھنؤ میں کسی کتاب کا اچھا طبع ہو، بغیر ممکن ہو گیا ہے۔ لیکن اس رسالے کو دیکھ کے ہمارا خیال بدل گیا۔ یہ نظافتی پریس لکھنؤ میں چھپا ہے۔ کاغذ بھی اسی مناسبت سے اچھا لگا گیا ہے۔

ہم اس رسالہ کا بڑے شوق کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں۔ اسکے قلمی معاونین میں ڈاکٹر سر محمد اقبال، مولوی علی حیدر صاحب طابطائی، مولانا صفی صاحب، سید سجاد حسین رضوی صاحب، ڈاکٹر بیج باور سہروردی، پنڈت کشن پرشاد کول، مولوی سید جالب صاحب علامہ عبدالمندیلوسف علی صاحب، اور سٹر فیروز الدین مراد کے ایسے مشاہیر اہل قلم کے نام ہیں۔ اور ان میں سے اکثر حضرات کے مضامین پہلے اور دوسرے رسالوں میں موجود ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ یہ رسالہ بہت ترقی کرے گا۔ اردو دان حضرات کا فرض ہے کہ اس کی قدر کریں۔

سائز ۲۶-۲۰ چند سالانہ پانچ روپیہ بیچر صاحب خیابان وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ کے پتہ سے منگوا جائے۔



بلاد ہندوستان



تیرہویں صدی عیسوی کے وسط میں یورپ کے ساحل بالکل غیر محفوظ تھے۔ بحری قزاق اس قدر زیادہ ہو گئے تھے کہ وہ صرف بحری راستوں ہی میں لوٹا رہیں کرتے تھے بلکہ اکثر ساحلی شہروں میں بھی گھس آتے اور لوٹا مار کے چل دیتے۔ حال بحری راستوں کا تھا خشکی پر بھی راستوں کا یہی حال تھا کوئی راستہ چروں اور ڈاکوؤں پر صاف نہ تھا کوئی ایسی تربدست سلطنت نہ تھی جو ان لوٹا مار کو نواہن کا اتصال کر دیتی۔ لیکن اس پر شور و شر زمانے میں بھی شمالی جرمنی کے شہروں کی تجارت روز افزوں ترقی کر رہی تھی۔ وہاں یہ حالت تھی کہ ماجرؤں سے سرکاری محصول تو وصول کر لیا جاتا۔ مگر ان کی اور ان کے مال کی کافی حفاظت نہ کی جاتی ساتھ ہی اس کی اجازت نہ تھی کہ ماجرؤں اپنے مسلح سپاہی ساتھ رکھیں نتیجہ یہ تھا کہ ان ماجرؤں کا مال بالکل غیر محفوظ تھا۔

جرمنی کے شمالی علاقہ جات میں تجارت روز افزوں ترقی کرتی جاتی تھی۔ ہیمبرگ۔ ٹوبک۔ اور بریمن بڑی منڈیاں قرار پانے لگی تھیں۔ ان شہروں کے ماجرؤں کو زیادہ خوف و ڈاک کے بادشاہ ولاڈار سے رہا کرنا۔ اور ہمیشہ اُس کے حملے روکنے پڑتے۔ اس کے علاوہ دریائے آلب میں بھی قزاق موجود تھے جو چھوٹی چھوٹی تیز رو کشتیوں پر ہر جگہ موجود رہتے اور کوئی مال ایک مقام سے دوسرے مقام تک اطمینان کے ساتھ نہ پہنچ سکتا۔ پھر خشکی کا راستہ بھی قابل اطمینان نہ تھا۔ یہ ساری خرابیاں خود اسی ملک کے زمینداروں اور ماجرؤں کی بدولت ہو رہی تھیں جنہوں نے ان تجارتی شہروں کے اندر اور وہاں

کے اجروں کی آمد و رفت میں لوٹ مار مچا رکھی تھی۔

ان حملوں کے روکنے اور تاجروں کو محفوظ رکھنے کے لیے ۱۱۷۱ء میں بن تجارتی شہروں یعنی ہیمبرگ، ہاڈسن اور ڈٹن ایش میں ایک معاہدہ ہوا۔ یہ تینوں خود مختار اور آزاد شہر تھے یعنی خاص وہاں کے لوگوں کے سوا اور کسی حکمران کی عملداری نہ تھی وہیں کے لوگ اپنے اپنے شہر کا انتظام کرتے۔ چند روز بعد شہر ہیمبرگ اور شہر لوکس میں بھی ایک خاص قسم کا تجارتی معاہدہ ہوا۔ ان معاہدوں میں یہ قرار پایا کہ یہ تجارتی شہر آپس میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔ اور اگر کسی شہر پر یا کسی شہر کے مال و اسباب پر راستہ میں بھی کہیں حملہ ہو گا تو سب ایک دوسرے کی حفاظت کریں گے۔

۱۱۷۷ء میں شہر برٹس دنک بھی اس معاہدے میں شامل ہو گیا اور موقع کے لحاظ سے ہی ان سب شہروں کے لیے مال رکھنے کا گودام قرار پایا۔ پھر در ترکی کی طرف سے ہندوستان کا جو تجارتی مال آبادہ اٹلی کو بندرگاہوں سے ہیمبرگ جاتے ہوئے برٹس دنک سے گزرتا اس واسطے ہی شہر مال جمع کرنے کا صدر مقام قرار پایا۔ چند روز بعد ویرت سے شہر بھی اس معاہدے میں شامل ہونے لگے اور اب اس تجارتی اتحاد کا نام ہنسا قرار دیا گیا۔

یہ وہ نامک زبان میں لفظ ہنساکے معنی کسی خاص حق یا فائدہ کے ہیں۔ اور بعض لوگ اس کی اصل قدیم فرانسیسی زبان کے لفظ ہنساکے معنی سے نکالتے ہیں۔ جس کے معنی اُس زبان میں "جماعت یا گروہ" کے ہیں۔ یہ نام خواہ کسی زبان سے لیا گیا ہو۔ مگر اس میں شک نہیں کہ دونوں کی اصل ایک ہی ہے۔ اور یہ نام دونوں طرح اس موقع پر موزوں معلوم ہوتا ہے۔

یہ تجارتی اتحاد ہنساکے کامیاب ثابت ہوا اور چند وزین بہت سے شہر اس میں شریک ہو گئے ایک وقت جب وہ پورے ترقی پزیر دنیا کی پچاسی شہر اس میں شامل تھے۔ زیادہ تعداد جرمنی کے شہروں کی تھی مگر اس میں ناروے، سویڈن، ہالینڈ، فرانس، اٹلی، اسپین، پرتگال اور انگلستان کے تجارتی شہر بھی شریک تھے۔

آخر اس اتحاد ہنساکے اتنی ترقی کی کہ یورپ کے بعض حکمران اسے حسد کی نگاہوں سے دیکھنے لگے اور اپنے اپنے مقبوضہ شہروں کو انھوں نے اس اتحاد سے الگ کر لیا۔ مگر اس کے بعد بھی اتحاد ہنساکے قوت میں کوئی کمی

نہیں آئی کیونکہ جرمنی کے کل شہر اس میں شامل تھے۔ اور اب اتحاد ہنس نے یہ قاعدہ مقرر کر لیا کہ باہر کا کوئی شہر اس اتحاد میں نہ شامل کیا جائے۔ اسی زمانے میں اتحاد ہنس کے چار حصے کر دیے گئے۔ اور ہر حصہ کا ایک صدر مقام قرار پایا۔ پہلے حصہ کا صدر مقام ٹوبک تھا جس کی نگرانی میں ہیمبرگ۔ دوسرا شک اور ڈسمار وغیرہ تھے۔ دوسرے حصہ کا صدر کوٹن تھا جس کے ماتحت کلینو۔ گلڈرس اور ڈسٹ فالیا اور اسکے قرب و جوار کے شہر تھے علاقہ جات ٹیکسنی اور بے نیڈان برگ کا صدر مقام بزنس وک قرار پایا۔ تیسرا ویشیا اور کیو دنیا کے شہروں کا صدر ڈین زگ ہوا۔

اس اتحاد یا انجمن ہنس کے اعزازی مربی اور سرپرست بھی ہونے جو گرنڈ ماسٹر (آقاے اعظم) کہلاتے۔ ڈکمارک۔ سوڈن اور نیز اسپین کے بادشاہ وقتاً فوقتاً اس کے مربی و سرپرست ہوتے ہیں۔ مگر سوٹھوین صدی کے بعد کوئی مربی نہیں بنا یا گیا۔

اس انجمن نے اپنی تجارت کے گنج اور گودام یورپ کے مختلف مقامات پر بنائے لندن کا گودام ۱۷۷۷ء میں بنا۔ برڈگس کا ۱۷۷۷ء میں۔ وڈاگرڈ کا ۱۷۷۷ء میں اور برگن کا ۱۷۷۷ء میں۔ برڈگس کا گودام چند روز بعد آٹسٹا۔ رپ میں آیا۔ پھر آسٹریڈم میں منتقل ہو گیا۔

بعض حصہ میں حکمرانوں کی مدد اور بعض کی سرپرستی سے اس انجمن کو بڑی قوت حاصل ہو گئی ۱۷۷۷ء میں شہر کوٹن میں ایک باضابطہ قانون بنایا گیا جو کل بلاد ہنس پر حاوی تھا اور حقیقت یہ ہے کہ چودھویں صدی عیسوی میں اس اتحاد ہنس کی دولت تجارت کا مال بالکل محفوظ ہو گیا۔ اور بادشاہوں سے لے کر معمولی لوگوں تک ہر طبقہ میں اس انجمن کا بڑا لحاظ کیا جانے لگا۔ اُس زمانے کے حکمرانوں کی نظروں میں تجارت کوئی وقعت نہیں رکھتی تھی۔ مگر اسی وقت سے تجارت کی اصل حقیقت ظاہر ہونے لگی اور آخر میں اس کو وہ درجہ حاصل ہوا کہ اس نے حکومتوں اور سلطنتوں تک کو متا دیا۔

مقام کوٹن میں اس اتحاد ہنس کے جو قواعد مقرر ہوئے وہ یہ

تھے کہ تجارت کے مال کو چورون اور ڈاکوؤں سے بچایا جائے۔ دوسرے ملکوں میں تاجروں کا عروج و قار قائم رکھا جائے اور ان کی حفاظت کی جائے جو شہر اتحاد میں شامل ہیں ان کی تجارت کو ممالک غیر میں فروغ دیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو ہر چیز کی تجارت کے ٹیکس حاصل کر لیے جائیں تاکہ دوسرے شہروں کے تاجر اس چیز کو نہ بیچ سکیں۔ اور ہر بازار میں انصاف اور امن قائم رکھا جائے۔ ان امور کی نگرانی کرنے اور دغا بازوں سے بچانے کے لیے ہر بازار میں ایما ندر عمدہ دار مقرر کیے جائیں جو اس اتحاد ہنساکے ماتحت ہوں۔ اور ان پر کسی کا اثر نہ ہو۔

انجمن کا نظام قائم رکھنے کے لیے ساحلی شہروں کو حکم دیا گیا کہ مسلح جہاز ہٹا کرین تاکہ بحری اور بری راستوں میں تجارت کا مال بہ آسانی اور بغیر کسی خطرے کے ایک مقام سے دوسرے مقام تک جاسکے۔ اتحاد ہنساکے شہروں کے لیے یہ ضروری تھا کہ اپنے ذمے کی واجب الادا رقمیں پابندی کے ساتھ ادا کر دیا کریں۔ عدم وصول یا تاخیر کی صورت میں وہ شہر اتحادی حقوق سے خارج کر دیا جاتا اور اس مقام کے مال کی کوئی ذمہ داری نہ رہتی۔

بلاد ہنساکے انجمن کے باقاعدہ جلسہ عموماً ہر تیسرے سال ٹوکیو میں منعقد ہوتے اور یہی شہر اس انجمن کا صدر مقام قرار پایا تھا۔ بین انجمن کا خزانہ اور صدر دفتر بھی تھا۔ اس سہ سالہ جلسہ میں جس شہر کے نمائندے وقت پر نہ پہنچتے ان پر ہر روز کی غیر حاضری پر بیس فلا رن (تقریباً ڈیڑھ سو روپیہ) جرمانہ ہوتا۔ اور جس شہر کی طرف سے نمائندے نہ آتے اس سے باز پرس کی جاتی۔ لیکن کسی شہر کی جانب سے اگر تین دفعہ ایسی ہی غلطی ہوتی تو وہ اتحاد سے خارج کر دیا جاتا۔ کسی شہر کے ذمے اگر جرمانہ وصول طلب ہوتا اور وہ فوراً ادا نہ کرتا تو وہ ان کا کوئی باشندہ اگر کسی دوسرے اتحادی شہر میں مل جاتا تو پکڑ کے قید کر لیا جاتا اور جب تک واجب الادا رقم نہ وصول ہو جاتی اسے آزادی نہ نصیب ہوتی۔ ممالک غیر میں اس اتحاد

کی جو کوٹھیاں تھیں اُن کا انتظام بڑی سختی اور پابندی کے ساتھ کیا جاتا۔ وہاں کے منتظمین اور شہر کے تجارت اپنی سالانہ قائم رکھنے کے لیے بہت ہی سادی زندگی بسر کرتے۔ کسی عیش و عشرت کے جلسہ میں نہ جاتے۔ اور اُنہیں شادی کرنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ بعد میں یورپ کی جن عظیم الشان کمپنیوں نے دور دراز ممالک سے تجارت کرنی شروع کی اُن کے قواعد و ضوابط اسی اتحاد ہنساکے اُن قاعدوں کے مطابق تھے جو اُس نے ممالک غیر میں تجارت کرنے کے لیے مقرر کر رکھے تھے۔

اتحاد ہنساکا انتظام بہت اچھا تھا اور اس کا کاروبار ایسی خوبی کے ساتھ جاری رکھا گیا کہ سب اسکی تعریف کرنے لگے۔ اس میں منتظمین کو بڑی سخت اور مسلسل محنت کرنی پڑی تھی۔ مگر عام لوگوں پر اتنا اثر پڑا کہ سب کو اُس کے ساتھ ہمدردی پیدا ہو گئی۔ اور اُن کا یہ خیال تھا کہ بڑی ٹیک نیٹمی اور جانفشانی سے ملک کی خدمت انجام دی جا رہی ہے۔ چند وزین اُسے بڑی اہمیت حاصل ہو گئی۔ مگر باوجودیکہ وہ شہروں اور سمندروں پر حکومت کر رہی تھی لیکن کسی بادشاہ نے ایک حکمران کی حیثیت سے اُسے کبھی نہیں تسلیم کیا۔ اُس کے پاس دولت بیمار تھی۔ اور آمدنی کے ذرائع غیر محدود تھے۔ لہذا یہ بات خود بہ خود پیدا ہو گئی کہ بادشاہوں کی اطاعت کرنے کے بجائے یہ انجمن بادشاہوں پر حاوی ہو کر اُن کے اوپر حکومت کرنے لگی۔

انگلستان میں اُس نے اپنے اثر سے یہ بات منوالی کہ اتحاد ہنساکے ذریعہ جس قدر مال ملک کے باہر جاتا اس پر کوئی محصول نہ لیا جاتا۔ ڈنمارک سویڈن اور روس میں جو مال اس اتحاد کے انجمنوں یا کارکنوں کے ذریعہ ملک کے اندر جاتا اس پر محصول معاف ہو گیا۔ یہ ایسے حقوق تھے جو اُس زمانے کے بادشاہ کسی کو خوشی کے ساتھ کبھی نہ دیتے مگر بات یہ ہے کہ اتحاد ہنساکے اردن افزوں ترقی اور اس کی بیشمار دولت اور عام لوگوں میں اس کی شہرت اور ہر دلعزیزی کو دیکھ کر یورپ کے سب بادشاہ اُس سے دہنے لگے تھے۔ اتحاد ہنساکے غیر معمولی کامیابی اور ترقی کا راز اس کے زیر اثر شہروں کی وسیع تجارت تھی۔ یہ شہر پہلے ہی سے تجارت کے مرکز واقع ہوئے

تھے۔ اب اس اتحاد کی بدولت انھیں امن اور اطمینان نصیب ہوا تو دفعۃً ایسے
 بڑھے کہ سب کو حیرت مہونے لگی۔ ان شہروں کے عروج کے ساتھ ساتھ اتحاد
 ہنساک کی بھی ترقی ہوتی گئی۔ آخر یہ حالت ہو گئی کہ سارے یورپ میں کوئی چھوٹے
 سے چھوٹا تجارتی مقام یا بازار ایسا نہیں رہ گیا جو اس تجارتی اتحاد کے اثر
 میں نہ آ گیا ہو۔ اس کی ترقی کا دوسرا بڑا سبب یہ تھا کہ اتحاد کے پاس بہت سی
 فوجیں اور جنگی جہاز موجود تھے۔ ابتدا میں یہ اتحاد مال تجارت کی حفاظت یعنی
 اس مال کو حملہ آوروں سے بچانے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ اُسے ملکی معاملات
 سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مگر بعد میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ اکثر خود اس اتحاد
 نے اعلان جنگ کر کے دیگر ممالک پر فوج کشی کی۔ اس نے ناروے کے دو
 بادشاہوں آئرک اور ہارون کو مغلوب کیا۔ ولاڈی مارٹا شاہ ڈنمارک
 کے مقابلے میں اعلان جنگ کر کے فوج کشی کر دی۔ اتحاد ہنساکے جہازوں
 کا جنگی بیڑا ڈنمارک کے دارالسلطنت کو بن ہیگن تک جا پہنچا اور بادشاہ کو مجبوراً
 شہر چھوڑ کے بھاگ جانا پڑا۔ پھر صلح اس شرط پر ہوئی کہ سلطنت ڈنمارک کا جزیرہ
 شوئن سولہ سال کے لیے اتحاد میں اس کے قبضہ میں دے دیا گیا۔ یہ جزیرہ بحیرہ
 بالٹک کے دامنہ پر واقع ہے۔ لہذا نتیجہ یہ ہوا کہ سارا بحیرہ بالٹک اتحاد ہنساکے
 زیر اثر ہو گیا۔ ایک مرتبہ اس اتحاد کے جنگی بیڑے نے سویڈن کے بادشاہ
 کو تخت سے اُتار کے اُس کا تاج و تخت اپنی مرضی کے مطابق ممکن برگ
 کے ڈیوک آلبرٹ کے حوالے کر دیا۔ مسئلہ ۱۷۷۱ء میں اس اتحاد کو بن ہیگن پر دوبارہ
 فوج کشی کا ارادہ کیا اور ۱۷۸۲ء جنگی جہاز آراستہ کر لیے جن پر بارہ ہزار سپاہی
 سوار تھے ۱۷۸۵ء میں برٹش وک کے ڈیوک نے خاص شہر برنس کا محاصرہ کر لیا
 مگر اتحاد ہنساک کی فوجیں اس آیزاد شہر کی مدد کے لیے پہنچ گئیں اور ڈیوک
 کو محاصرہ اٹھاتے ہی بنی شہر ڈان زگ کے محاصرے کو اتحاد ہنساک کی مدد پر
 اتنی جرات ہوئی کہ اُس نے شاہ ڈنمارک کے مقابلہ میں جنگ کا اعلان
 کر دیا۔

انگلستان۔ ڈنمارک اور ہالینڈ کو اپنی تجارت قائم رکھنے اور اسے

وسعت دینے کے لیے بلاد ہنسا کی انجمن سے تعلقات رکھنے پڑے۔ اس اتحاد نے بحر شمالی اور مشرقی یورپ میں ڈاکوؤں اور راہزنوں کا بڑی کامیابی کے ساتھ استیصال کر دیا تھا۔ اس نے بحری قوانین بھی مقرر کر دیے تھے جن کی وجہ سے بڑا امن ہو گیا اور ہر جگہ ایک ہی سا طریقہ رائج تھا۔ اس کے علاوہ اُس نے شمالی یورپ میں بہت سے بندرگاہ اور چوڑی نہریں بنوا دیں جن میں جہازوں کی آمد و رفت ہونے لگی اور تجارت کے نئے راستے کھل گئے۔ مگر سب سے زیادہ نمایاں کام جس سے اس کے اثر اور اقتدار کا پتہ چلتا ہے یہ کیا کہ مختلف اور دور درواز مالک میں ایک ہی قسم کے وزن اور پیمانے رائج کر دیے۔ اس سے ہر جگہ کے تاجروں کو خرید و فروخت اور تبادلہ اشیاء میں بڑی آسانی ہو گئی۔

اتحاد ہنسا کی ترقی اس وجہ سے ہوئی تھی کہ اُس زمانے کی حکومتیں

مزدور تھیں اور بحری قزاقوں کا اتیصال نہیں کر سکتی تھیں اب یورپ میں طاقتور سلطنتیں پیدا ہو گئیں۔ باقاعدہ حکومتوں نے امن و امان کا ذمہ لے لیا۔ بحری ڈاکہ زنیوں کا پہلے ہی خاتمہ ہو چکا تھا۔ یورپ کے بادشاہوں نے خود بھی تجارت کرنی اور اس سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔ چھوٹے چھوٹے شہروں کو یہ نظر آیا کہ بڑے تجارتی شہروں نے ہمارے حقوق پامال کر ڈالے ہیں۔ بڑے شہر بھی اب بحری مرکز نہیں باقی رہے۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ کوئلمبس اور ڈاس کو دی گائے امریکہ اور ہندوستان کے راستے کھول دیے۔ یورپ کے حالات میں جب تبدیلیاں ہوئیں تو اتحاد ہنسا کا زور بھی ٹوٹ گیا اور اس کا تخریب شروع ہو گیا۔

اگر اُس وقت جرمنی کی حکومت فرانس یا انگلستان کے مقابلے کی ہوتی تو وہ اپنے ان شہروں کی محافظ بن کے بیرونی علاقہ جات میں اس کی تجارت قائم رکھنے کی کوشش کرتی۔ مگر واقعہ اس کے برعکس تھا۔ اتحاد ہنسا کوئی ایسی سلطنت یا حکومت نہ تھی جسے دیگر مالک نے تسلیم کر لیا ہو۔ وہ صرف ایک تجارتی انجمن تھی جب اُن طاقتور سلطنتوں نے خود تجارت کرنی شروع کی تو اس انجمن کو دبا دینا چاہا۔ یورپ کی مشہور تیس سالہ جنگ "میں اتحاد ہنسا کی ساری

جنگی قوت کا خاتمہ ہو گیا۔ تجارتی حقوق جو اسے بیرونی ممالک میں حاصل ہو گئے تھے وہ بھی رفتہ رفتہ اُس سے نکلنے لگے۔ یہ اتحاد باہمی نفع کے خیال سے وجود میں آیا تھا۔ جب اس سے کوئی فائدہ نہیں نظر آیا تو چند ہی روز میں اس کا خاتمہ ہو گیا۔ ۱۸۶۱ء میں اس اتحاد کا سب سے آخری جلسہ شہر لوہک میں منعقد ہوا۔ مگر اس میں جتنے ارکان شریک ہوئے وہ اپنے شہروں کی طرف توجہ درخواست کر کے آئے تھے کہ ہمیں مجلس سے علیحدگی کی اجازت دی جائے۔

اس کے بعد بھی تین شہر ہبرگ۔ لوہک اور تہمین اس اتحاد کے نام لیوا باقی رہ گئے۔ اُنھوں نے آپس میں وہی تعلقات قائم رکھے اور ہنساکے نام کو زندہ رکھنا چاہا۔ ۱۸۷۱ء کے عہد نامہ میں ان تینوں شہروں کی اتحادی مجلس ہنساکے تسلیم کی گئی۔ پھر ۱۸۷۶ء میں جو کانگریس آسٹریا کے دار السلطنت ویانا میں ہوئی اُس میں بھی ان شہروں کے متحدہ حقوق تسلیم کیے گئے اور ایک شہر فربک فرٹ کو بھی اسی قسم کے حقوق دے کر جرمنی کے اتحاد ہنساکے میں شامل کر دیا گیا۔

مگر اس کے بعد ہنساکا نام بالکل مٹ گیا۔ ہر شہر تجارتی حیثیت سے آزاد ہے اور اُس قسم کا کوئی تجارتی اتحاد دوسرے شہروں سے نہیں قائم رہا اور اس اتحاد نے ہر شہر میں جو تجارتی کوٹھیاں بنائی تھیں فروخت کر دی گئیں۔ لندن کی کوٹھی ۱۸۵۵ء میں اور آئٹ ویرپ کی کوٹھی ۱۸۷۲ء میں بیچی گئی جس پر اس اتحاد کا خاتمہ ہو گیا۔ اس انجمن نے اُس زمانے میں ملک کی تجارت کو محفوظ رکھ دیا تھا جبکہ سارے یورپ میں کوئی سلطنت ایسی نہ تھی جو اس کام کو اس خرابام دیتی اور انگلستان کی پارلیمنٹ میں اتحاد ہنساکے متعلق کہا گیا کہ اُس نے ملک کو اصول تجارت کی بہترین تعلیم دی ہے۔ اتحاد ہنساکے نے آخر میں یہ کوشش شروع کی کہ ملک کی ساری تجارت اپنے ہاتھ میں لے لے اور کسی کو تجارت کرنے کا اختیار نہ ہو۔ دراصل یہی چیز اُس کے منزل کا باعث ہوئی۔

تیسری صدی ہجری کا ایک عی نبوت صاحب الزنج

عباسی خلیفہ المہدی باللہ تخت خلافت پر رونق افروز ہوا ہی تھا کہ ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا اور خلیفہ کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا پورا نام علی بن محمد بن عبد الرحمن حیم تھا۔ مگر عربی تاریخوں میں صاحب الزنج کے نام سے مشہور ہے کیونکہ اس نے زندگی یعنی جتنی غلاموں کو ہکا کے اپنے ساتھ کر لیا تھا اور وہی زیادہ تر اس کے طرفدار تھے۔ یہ شخص بنی عبد القیس سے تھا۔ اور سرمن راسے میں رہتا تھا۔ پھر وہ اکتوکل کے بیٹے المنصور کے مصاحبوں میں شامل ہو گیا۔ اور اُس کی تعریف میں اشعار کہا کرتا تھا۔ المنصور اس کو کچھ دے دیا کرتا تھا۔ آخر وہ مسئلہ مین سرمن راسے سے بحرین میں چلا آیا اور یہیں آکے اُس نے نبوت کا دعویٰ کیا اور کہا میں حضرت علی کی اولاد میں ہوں۔ حضرت علی کو اپنا جد ثابت کرنے کے لیے اپنا نسب یوں بیان کرتا۔ علی بن محمد بن احمد بن عیسیٰ بن زید بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما۔ اور کبھی کہتا کہ میں حسین بن عبید اللہ بن عباس بن علی بن ابی طالب کی اولاد میں ہوں اور لوگوں کو اپنی اطاعت و اقتدا کی دعوت دیتا۔ اس طرح کچھ لوگ اُس کے ساتھ شریک ہو گئے اور اسے نبی مان لیا۔ لیکن اسی کے ساتھ اس کی مخالفت بھی شروع ہو گئی کیونکہ بہت سے سچے مسلمان تھے جو اُس کے دعوؤں کو جھوٹا جانتے۔

آخر موافقین اور مخالفین میں اس قدر رنج بڑھا کہ لڑائی کی نوبت آگئی جس میں چیز آدمی قتل ہوئے۔ بحرین کے بعض لوگ اُسے نبی سمجھتے۔ اُس کو خراج ادا کرتے۔ اس کے احکام کی تعمیل کرتے۔ اور اس کی طرفدار بن کر اپنا ہی فوج سے لڑتے تھے۔ مگر جو سچے مسلمان تھے وہ خلیفہ کے مطیع فرمان رہے۔ اور اُنھوں نے باخون کو اس قدر دبا کہ اُن کے بنا۔ نہ کچھ نہ بنی۔ اور صاحب الزنج بحرین سے بھاگ کے اتھار میں چلا آیا۔ اس وقت بحرین والوں کی ایک جماعت اُس کے ساتھ ہو گئی تھی

گرا سے آسمان میں بھی پناہ نہ ملی اور اپنے ہمراہیوں سمیت مختلف جنگلوں میں مارا
بارا پھرتا پڑا۔

اسی اثنا میں وہ ایک دن کہنے لگا کہ جنگل میں مجھ پر کچھ ایسی نشانیاں
نمودار ہوئی ہیں جن سے سری امامت اور نبوت ظاہر ہوتی ہے۔ ان میں سے
ایک یہ ہے کہ مجھ کو قرآن کی بعض سورتوں کی تلقین ہوئی جو مجھے فوراً ازبر ہو گئی
ہیں۔ اور وہ بسم اللہ، سورہ کہف اور سورہ قص ہیں۔ دوسرے یہ کہ
جب میں غور کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ جہاں کہیں پہنچتا ہوں وہاں کی زمین
سرسبز اور بار آور ہو جاتی ہے۔ اور ابر میرے اوپر سایہ کیے رہتا ہے۔ پھر ایسی
ابر سے مجھ کو ایک آواز سنائی دی کہ بھرہ چلے آؤ۔ غرض اسی قسم کی یہودہ ہیں
بیان کر کے لوگوں کو گمراہ کرتا تھا۔

علامہ جلال الدین سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں لکھا ہے کہ اس شخص نے
دعویٰ کیا کہ میں لوگوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں تو لوگوں نے اس کی
رسالت سے انکار کر دیا۔ اُس کے پاس ایک منبر تھا جس پر چڑھ کے حضرت عثمان
حضرت علیؓ معاویہؓ زبیرؓ طلحہؓ اور سیدتنا عائشہؓ (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) کو
گالیاں دیا کرتا تھا۔ تاریخ ابن اثیر اور ابن خلدون میں ہے کہ وہ خارجیوں کا
ہم خیال تھا۔ اس سے اُس کا یہ دعویٰ کہ حضرت علیؓ کی اولاد میں ہے غلط ثابت
ہوتا ہے۔

سب سے پہلے وہ ۵۵ھ میں عام لوگوں کے سامنے نمودار ہوا۔
اس سے پہلے وہ اپنی کارروائیاں خفیہ طریقہ سے کرتا رہا تھا۔ اب اُس نے علامہ
خلافت کی مخالفت شروع کی اور ان غلاموں کو دعوت دی جو اطراف بصرہ میں لوگوں
کے پاس تھے۔ اس کے گرد بہت سے غلام جمع ہو گئے۔ تاریخ نے اُن سے آزاد
کا وعدہ کیا اور مختلف احسانات کی امید دلائی جب اُن غلاموں کے اکوڑ میں
سے کوئی اپنے غلام کو انگٹے آتا تو وہ اپنے غلاموں کو بلوا کر اُس کے آقا کو
خوب پٹواتا۔ پھر اُسے قید کر دیتا اور چند اور تکلیفیں دے کے چھوڑ دیتا۔ لوگوں
نے یہ دیکھا تو اپنے فرار شدہ غلاموں کا مطالبہ چھوڑ دیا۔

صاحب الزنج ان غلاموں اور اپنے دوسرے ہراہیوں کو ہر وقت نصیحتیں کیا کرتا۔ اور اپنی پیروی کی ترغیب دیا کرتا تاکہ لوگ ساتھ چھوڑ کے نہ چلے جائیں۔ زنجی غلام اپنے آقاؤں کے پاس سے بھاگ بھاگ کے برابر اس کے پاس آنے رہتے اور اُس کے مطیع ہوتے جاتے۔ اب اُس نے اپنی فوج کے لیے ایک چھنڈا بنوایا جس پر یہ آیت قرآنی لکھی ہوئی تھی۔ **إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمَّنْهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ** (خدا نے مسلمانوں سے اُن کا نفس اور مال جنت کے عوض میں خرید لیا ہے) غرض ان ترکیبوں سے اس کی جماعت روز بروز بڑھتی گئی۔ یہ لوگ بد معاشیان اور لوٹا مار کرتے پھرتے تھے۔ لوگوں کو ستانے اور اُن کا مال و اسباب زبردستی چھین لیتے۔

اس کے بعد صاحب الزنج شہر آبلہ کی جانب گیا۔ وہاں کے لوگوں نے اُس کا مقابلہ کیا مگر شکست ہو گئی۔ اور شہر پر باغیوں کا قبضہ ہو گیا۔ پھر اُس نے قادیسہ کی جانب رخ کیا۔ اُس کو فتح کر کے خوب لوٹا۔ اب اُس کے پاس بہت سا مال و اسباب اور کافی تعداد میں ہتھیار جمع ہو گئے۔ اہل بصرہ کو اس کی ان زیادتیوں کی خبر ملی تو وہ مقابلے کے لیے نکلے مگر اُنھیں بھی شکست ہو گئی۔ صاحب الزنج نے بصرہ کے شکست خوردہ لوگوں میں سے بہتوں کو قتل کر کے اُن کے ہتھیار اپنے قبضے میں کر لیے۔ اس کے بعد اور کئی جماعتیں اُس کے مقابلے پر آئیں۔ مگر اُنھیں بھی شکست اٹھانی پڑی۔ پھر وہ سے پھر قادیسہ میں لے کے اس کی سرکوبی کو بڑھے مگر اُنھیں بھی کامیابی نہ ہو سکی۔ باغیوں کے مقابلے میں شکست اٹھانی پڑی اور ایک قادیسہ بھی قتل ہو گیا۔ ان قادیسہوں کے ساتھ بہت سی کشتیاں بھی تھیں جو ہوا کی تیزی سے کنارے پر آگئیں۔ ان میں بہت سا قیمتی مال و اسباب اور اسلحہ تھے۔ اُنھیں باغیوں نے جی بھر کے لوٹا۔

جب حالت بیان تک پہنچی تو اس فتنہ کو دفع کرنے کے لیے ترکی پیہ سالار ابو ہلال چار ہزار فوج کے ساتھ روانہ کیا گیا۔ مگر اسے بھی جاتے ہی شکست ہو گئی اور اُسکی فوج والے بہت زیادہ قتل ہوئے۔ پھر پیہ سالار ابو منصور ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ بھیجا گیا اور اُس نے جا کے اس فتنہ کو دبا دیا۔

صاحب الزنج کے ساتھیوں میں یحییٰ بن خالد اور سلیمان بن جامع بڑے نامی لوگ تھے اور یہی اُس کی فوجوں کے افسر تھے سورجین کے غلاموں میں ریحان نے سب سے پہلے اُس کا ساتھ دیا اور اُس کا شریک ہو گیا۔ وہ بیان کرتا ہے کہ میں اپنے آقا کے غلاموں کا داروغہ تھا۔ اور اُن کے کھانے پینے کا بندوبست کیا کرتا تھا۔ اتفاق سے صاحب الزنج کے چند ساتھیوں نے مجھ کو گرفتار کر لیا اور اُس کے پاس لے گئے اُس نے کہا کہ اب تم میرے مطیع ہو جاؤ اور میرا کھانا دو۔ میں نے منظور کر لیا تو اس نے مجھ سے پوچھا تم کہاں سے آئے ہو۔ میں نے بتا دیا تو پھر بصرے کے حالات پوچھے میں نے جواب دیا میں کچھ نہیں جانتا۔ پھر اس نے سورجین کے غلاموں کے متعلق پوچھا۔ میں نے اُن کے حالات بیان کر دیے۔ اس کے بعد اس نے مجھے اپنے مذہب کی دعوت دی۔ میں نے اُسے بھی قبول کر لیا۔ پھر اُس نے مجھے حکم دیا کہ تم سے جس قدر ہو سکے زنجی غلاموں کو دھوکا دے کے ہاتھ لے آؤ۔ اور مجھ سے وعدہ کیا کہ تم کو اُن سب کا افسر بنا دوں گا۔ دوسرے دن میں واپس گیا۔ اور زنجی غلاموں کی ایک بڑی جماعت کو ہکا کے لے آیا۔

اسی طرح اور لوگوں کو بھی اُس نے مقرر کر رکھا تھا جو غلاموں کو ہکا کے اور فریب دے کے اس کے پاس لے آتے تھے۔ بصرے اور دیگر مقامات کے غلام برابر آتے رہے۔ اور وہ سب آزادی اور آئندہ ترقی و بہبودی کی امید پر اُس کے ساتھ ہو جاتے۔ اس طرح اس کے پاس غلاموں کی ایک بہت بڑی تعداد جمع ہو گئی اُس نے ان سب کے سامنے ایک تقریر کی اور وعدہ کیا کہ تم سب کو افسر مقرر کروں گا۔ بہت کچھ مال و اسباب دوں گا۔ اور ستیہن کھا کھا کر اطمینان دلا یا کہ کبھی تم سے بیوفائی نہ کروں گا۔ اور تمہیں ذلیل نہ ہونے دوں گا اور کھارے ساتھ احسان کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھوں گا۔ اسی اثنا میں بعض غلاموں کے آقا اُس کے پاس آئے اور اپنے اپنے غلاموں کا مطالبہ کر کے کہا کہ ہم ہر غلام کے بدلے آپ کو پانچ دینار دین گے۔ مگر اس نے اُن کو بھڑکے بھل گرا دیا اور اپنے ہمراہی غلاموں کو حکم دیا کہ ہر غلام اپنے آقا کے پانچ پانچ کوڑے لگائے۔

صاحب الزنج جب کبھی غلاموں کے سامنے تقریر کرتا تو اُن کو اگلی تکلیف

زندگی یاد دلانا۔ اور کہتا غور کرو۔ پہلے تم لوگ کیسی سخت زحمت اور مشقت میں مبتلا تھے۔ پھر خدا نے اپنی مہربانی سے تم کو اس بلا سے نجات دی۔ اور آزاد کروایا۔ اب میں تم کو ہندی پرپو بچانا اور لونڈی غلاموں اور مال و دولت کا مالک بنادینا چاہتا ہوں۔

ایک زنجی رئیس جس کی کینیت ابوصالح تھی اُس کے پاس تین سو غلام لے آیا۔ اسی طرح مختلف تدبیروں اور چالاکوں سے جب اس کی فوجی قوت خوب بڑھ گئی تو انھیں غلاموں میں سے بعض کو اُس نے افسر مقرر کر دیا۔ اور اس کا اعلان کیا کہ جو شخص کسی غلام کو لائے گا وہ اسی کے متعلق کروا جائے گا۔ جیسا کہ روز بروز اُس کے ساتھیوں کی تعداد بڑھتی رہی۔ ہزاروں کی تعداد میں زنجی غلام اور دوسرے لوگ اس کے حلقہ گوش ہوتے گئے۔ اب اُس نے دیہاتوں اور شہروں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ خلیفہ نے کئی بار اس کی سرکوبی کے لیے فوجیں روانہ کیں۔ لیکن یکے بعد دیگرے سب کو شکستیں ہوتی گئیں۔ وہ ان لوگوں کو قتل کرتا اور شہروں اور دیہاتوں سے عورتوں اور بچوں کو کپڑے جاتا۔ یہ حالت چورہ سال تک قائم رہی۔ آخر اسلامی فوجوں نے اس پر غلبہ پایا اور ملک میں امن و امان قائم ہوا۔ علامہ جمال الدین سیوطی تحریر فرماتے ہیں کہ اس حکمران نے ہندوہ لاکھ مسلمانوں کو قتل کیا۔ بصرہ میں فقط ایک ہی دن میں تین لاکھ آدمی اس کی ستم آرائیوں کے شکار بنے۔ جب اُس کی قوت بہت زیادہ ہو گئی اور اس کے ظلم کی کوئی انتہا نہ رہی تو اس کے مقابلے کے لیے توفیق طلحہ بن متوکل فرمایا جو خلیفہ معتمد علیہ بن متوکل کا بھائی تھا بعض فوجوں کی افری کے لیے اُس کا بیٹا بھی ساتھ روانہ ہوا جو معتمد علیہ کے بعد معتضد کے لقب سے خلیفہ ہوا۔

علامہ سعدی اپنی تاریخ مروج الذهب میں صاحب الزنج کے متعلق لکھتے ہیں کہ متوفی اس باغی کے مقابلے کے لیے صفحہ ۱۷۷ میں روانہ ہوا۔ اور اپنے بیٹے ابوالعباس کو سوتق جیش کی طرف روانہ کیا۔ صاحب الزنج کا سپہ سالار شمرانی ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ قلعہ بند ہو گیا۔ ابوالعباس نے فوراً آگے بڑھ کے محاصرہ کر لیا اور چند روز میں نبردِ راسخہ فتح کر کے جو کچھ ملاوٹ لیا۔ پھر دوسرے

مقامات بھی فتح کر لیے اور جس قدر زنجی ان مقامات میں سے سب قتل کر دیے گئے۔ اس کے بعد توفیق آہوا زمین آیا وہاں زنجیوں نے جو خرمیان پھیلارکھی تھیں ان کی اصلاح کی اور تبصرہ میں واپس آیا۔ اس کے بعد بھی وہ برابر مقابلہ کر رہا یہاں تک کہ کوئی مقام صاحب الزنج کے قبضہ میں نہیں باقی رہا۔ اور صاحب الزنج گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔ اُس باغی نے چودہ برس اور چار مہینے کشت و خون کا بازار گرم رکھا۔ اور آسمان سر پہ اٹھا لیا۔ اس عرصہ میں اس نے لاکھوں چھوٹے بڑے عورت مرد و تیغ کیے۔ بہت سے شہروں اور دیہاتوں میں آگ لگا دی۔ اور اُس سارے علاقے کو تباہ و برباد کر دیا۔ ایک بار صرف شہر بصرہ میں اس نے تین لاکھ آدمی قتل کیے۔

اس واقعے کے بعد تہلبی نے جو صاحب الزنج کے ساتھیوں میں تھا۔ اور اس کا بڑا طرفدار تھا البصرہ میں ایک منبر نصب کیا وہ جمعہ کو سب کے ساتھ نماز پڑھتا۔ اور اس منبر پر کھڑے ہو کے لوگوں کو صاحب الزنج کے مذہب کی طرف بلاتا۔ جتنی عباس کے افسروں اور اکثر صحابہ کو گالیوں دیتا۔ اور ان پر لعنت کرتا۔ تبصرہ میں جو لوگ صاحب الزنج کے تیغ ستم سے بچ رہے تھے جمع ہوئے اور ارادہ کیا کہ تہلبی کو پکڑ کے قتل کر دیں۔ مگر اُسے خبر ہو گئی۔ اور اس نے مسلمانوں میں پھر قتل عام شروع کر دیا۔ اس میں بھی بہت سے قتل ہوئے۔ بہت سے دریا میں کود پڑے اور ڈوب کے مر گئے۔ کچھ بچ رہے جو مکاتون اور تہ خانوں کے اندر چھپ رہے۔ یہ غریب دن بھر موت کے ڈر سے چھپے رہتے۔ اور رات کو غذا حاصل کرنے کے لیے نکلتے تو کتوں کو پکڑ پکڑ کے ذبح کرتے اور کھا جاتے جیسا کہ تہلبی نے تو یوں اور جو ہوں پر گزارا کرنے لگے۔ یہاں تک کہ وہ بھی ختم ہو گئے تو یہ حالت ہوئی کہ ان میں سے جو شخص بھوک کے مارے مر جاتا باقی لوگ اس کو اپنی غذا بناتے۔ خیر کھانے کا تو مر کھپ کے کچھ اختتام ہو جاتا مگر بانی کو یہ لوگ بالکل تمساکر نہ۔ ان لوگوں میں ایک عورت بیان کرتی ہے کہ وہ بہنیں آپس میں لڑ رہی تھیں لوگوں نے وہ دونوں کو بھر کا ناشروع کیا کہ کہیں لڑ لڑ کے ان میں سے کوئی مرے تو اس کا گوشت کھا زمین آئے۔ وہ عورت بیان کرتی ہے کہ ان

میں سے کوئی آپس میں لڑ کے نہ مری تو ہم لوگوں نے اُن میں سے ایک کو کاٹ کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ اور کھا گئے۔ تھوڑی دیر میں اس کی بہن روتی ہوئی آئی۔ اس کے ہاتھ میں اس کی مقتولہ بہن کا سر تھا۔ ہم نے پوچھا کیوں روتی ہو؟ اس نے کہا اُن لوگوں نے اس کا بھی انتظار نہ کیا کہ وہ اچھی موت مرتی بلکہ اس کو زندہ ہی کاٹ کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور مجھ کو کھانے کے لیے صرف اس کا سر دیا ہے حالانکہ میرا حق زیادہ ہونا چاہیے۔ اس طرح کے بہت سے افسوس ناک واقعات اس زمانے میں پیش آئے۔ اور مسلمانوں پر بڑا ظلم ہوا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس قیامت خیز زمانے میں جس قدر لوگ قتل ہوئے ہیں اُن کا شمار اور احصاء محال ہے اور خداوند عالم کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ بعض کھتے ہیں کہ سچا پس لاکھ آدمی قتل ہوئے ہیں۔

جب یہ باغی قتل کیا جا چکا اور اس کا سر نیزے پر رکھ کے بغداد میں لایا گیا تو ایک عام جشن منایا گیا۔ مکان اور بازار سب گئے۔ لوگ خلوص دل سے توفیق کو دعائیں دیتے تھے۔ شرعاً اُس کی شان میں قصیدے کہے اور وہ لوگ جو باغیوں کے ظلم و ستم کی وجہ سے اپنے گھر بار چھوڑ کے بھاگ آئے تھے اب خوشی خوشی اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے۔

الغرض یہ چودہ برس مسلمانوں پر بہت سخت گزرے اور اس زمانے میں انھیں بڑی مصیبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ آخر اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم کیا اور اسن وامن قائم ہوا۔

ریویو

شمسون مخزون۔ انگریزی کے مشہور و معروف جادو بیان شاعر تئسن کی نظمیں بڑی شہرت اور وقت رکھتی ہیں۔ یہ سب نظمیں مذہبی رنگ لیے ہوئے ہیں بشرطیکہ چرن صاحب قندانی ان میں سے تین نظمیں کا اردو ترجمہ نظم میں کر دیا ہے۔ پہلی ”پیرے ڈائیس لاسٹ“ جو دوسری ”پیرے ڈائیس ری گینڈ“ اور تیسری ”سیمسن گونسس“ پہلی کتاب کے ترجمہ کا پہلا ایڈیشن فروز گم شدہ، دگلڈز پریس میں چھپا تھا۔

مہرودار علی



آج کل کے اٹلس یعنی جغرافی نقشے ساری دنیا کو دو دائروں کے اندر ظاہر کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک دائرے میں ایشیا۔ یورپا۔ اور افریقہ کے براعظم ہوتے ہیں۔ اور دوسرے دائرے میں شمالی اور جنوبی امریکہ۔ ان میں سے ایشیا والے دائرے کو پرانی دنیا اور امریکہ کو نئی دنیا کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ فقط اس وجہ سے ہے کہ ہمیں امریکہ کا حال ابھی چند صدیاں گزر رہا تھا کہ معلوم ہوا ہے۔

لیکن اگر پوچھا جائے کہ ان دونوں میں دراصل پرانی زمین کون سی ہے تو زمین کی ساخت پر غور کرنے کے بعد علم طبقات الارض کے ماہرین اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ ساری روئے زمین میں امریکہ کے جنوبی اور شمالی دونوں براعظم زیادہ قدیم ثابت ہوتے ہیں۔ پھر اگر ہم اس پر غور کریں کہ انسان کی پیدائش کو آج سے کتنے برس گزر چکے ہیں تو ہمیں ان امکانی تغیرات عالم کا بھی لحاظ کرنا پڑے گا جو تخلیق عالم کے بعد روئے زمین پر واقع ہوئے ہوں۔ ہم یہ سوال کر سکتے ہیں کہ بحر الکاہل میں اتنے بہت سے جزیرے کس طرح بن گئے۔ یا براعظم ایشیا اور شمالی امریکہ کے شمال میں دونوں کے خشکی کے حصے کیوں اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ بڑھ آئے ہیں گو یا ایک دوسرے سے ملنے اور معافقہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اگر آگ کھڑے صبر کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھتے اور افسوس کر رہے ہیں کیونکہ کوئی بہت بڑی قوت انہیں آپس میں ملنے نہیں دیتی ہے۔ بیشک وہ ملنا چاہتے ہیں

یا کبھی ملے ہوئے ہوں۔

جزائر لوشین اس خیال کو اور تقویت دیتے ہیں اور یہ امر خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ بحیرہ میزنگ جو ایشیا اور آفریقہ کے درمیان میں واقع ہے نسبتاً بہت کم گہرا ہے۔

یہ تو شمالی حصے کی حالت ہوئی اب جنوب میں دیکھنا آسٹینیا کے جزیرے اور ان کے چاروں طرف سمندر کا وہ حصہ جو انھیں گھیرے ہوئے ہے جو گویا ایک بہت بڑا بحرِ باغ ہے اور ہر قسم کی پھول پتیاں اس کثرت کے ساتھ سطح سمندر کے نیچے سے پیدا ہو کے اوپر نمودار ہو جایا کرتی ہیں کہ کسی دوسری جگہ اس کی مثال نہیں ملتی ہے۔ ان جزیروں پر اور سمندر کے نیچے بھی ہارڈن کی بہت سی اونچی اونچی چوٹیاں اور بلند زمینیں ہیں جن سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی زمانے میں یہ ایک بہت بڑا براعظم ہو گا جس نے بحرِ الکاہل کے بہت بڑے حصہ پر قبضہ کر رکھا ہو گا۔

یہی حال بحرِ اٹلانٹک کا ہے اور اس قسم کے تغیرات اُس میں بھی غیر ممکن یا تعجب خیز نہیں ہو سکتے جن لوگوں نے اس سمندر کی گہرائیوں کا بغور مطالعہ کیا ہے اُنھوں نے اس کی تہ میں ایسے بلند حصے مسلسل پائے ہیں جو آفریقہ کے مغربی ساحل سے لے کر جنوبی امریکہ تک برابر چلے گئے ہیں۔ بحرِ اٹلانٹک کی تہ میں یہ بلند حصے اس سمندر کی اوسط گہرائیوں سے تھائی حصے سے بھی کم گہرے واقع ہوئے ہیں۔ اور یہ چیز اس قدیم فسانے کو قرین قیاس کیے دیتی ہے جو ان دونوں براعظموں کی اکثر قوموں میں موجود ہے کہا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں ان دونوں براعظموں کے درمیان میں زمین کا ایک بہت بڑا اور شاداب و زرخیز حصہ واقع تھا جس نے ان دونوں خشکی کے بڑے حصوں کو آپس میں ملا دیا تھا۔ یہ زمین اٹلانٹس کہلاتی تھی اور اسی کی وجہ سے بحرِ اٹلانٹک کا نام مشہور ہوا۔

افلاطون نے اسی سرزمین اٹلانٹس کی بابت لکھا ہے کہ

وہاں بہت سے آباد شہر تھے اور وہ ملک ایک ایسی قوم کا گہوارہ تھا جس کے مال و دولت کی کوئی انتہاء تھی۔ اور جو تہذیب و تمدن کے اعلیٰ مدارج بھی طے کر چکی تھی۔ قدیم فلسطین کی طرح وہاں بھی ہر شہر کا حکمران ایک

بادشاہ تھا جن کے نام اب بھی یونانی دیوالا میں باقی ہیں۔

مصر یونین میں بھی ایک قدیم روایت یہ چلی آتی ہے کہ اُن کے آباد اجداد ایک ایسی سرزمین سے آئے تھے جو مغرب کی جانب بہت دور واقع تھی اور اٹلانٹس کہلاتی تھی۔ افلاطون سے ہم کو یہ بھی معلوم ہوا کہ اٹلانٹس کے لوگ زیادہ تر بحری تجارت میں مشغول رہتے تھے۔ اُن کے ساحلی شہروں میں بنیاد بندرگاہ بنے ہوئے تھے جہاں بڑے بڑے جہاز اپنے مال اُتارتے اور چڑھاتے رہتے۔ روئے زمین کے کل حصوں میں وہی تجارتی مال لاتے اور لے جاتے۔

افلاطون نے جن الفاظ میں اس سرزمین کا ذکر کیا جو وہ حسب ذیل میں اٹینینہ کے کارماے نمایان میں جن کا ذکر ہم تک پہنچ سکا ہے ایک بہت بڑی بات یہ بھی ہے جسے سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یونانیوں نے اُس عظیم الشان فوج کو تباہ و برباد کر کے کامل شکست دیدی جو بحر اٹلانٹک کے اس پار کسے آئی تھی۔ اور جس نے یہاں تک جرات کی کہ یورپ پر حملہ کر دیا۔ یہ بحر اٹلانٹک اُس زمانے میں جہاز رانی کے قابل تھا اور ہرقل کے سنو نوں کو درمیان میں جو آبنائے ہے اُس کے آگے ایک جزیرہ تھا جو ایشیائے کوچک اور آبیائے متحدہ رقبے سے بہت بڑا تھا۔ اس جزیرے سے ہر شخص بہ آسانی دوسرے جزائر میں پہنچ سکتا تھا اور اُن جزیروں سے اُس بڑے حصہ زمین تک جو سمندر چلا گیا ہے وہ بہت بڑا ہے اُس کے مقابلے میں سارا بحر روم ایک بندرگاہ نظر آتا ہے۔ وہ براعظم جو اس عظیم الشان سمندر کے دوسرے جانب واقع ہوا ہے بہت بڑا ہے۔ جزیرہ اٹلانٹس میں بادشاہ حکومت کرتے تھے جن کی قوت اور اختیارات غیر محدود تھے۔ پورا جزیرہ اٹلانٹس اور بہت سے چھوٹے چھوٹے جزیرے اور سمندر کی دوسری طرف والے براعظم کے کچھ حصے ان بادشاہوں کے قبضے میں ہیں۔ کسی زمانے میں ان بادشاہوں کی حکومت افریقہ میں لیبیا اور یورپ میں اٹلی کی سرحد تک پہنچ گئی تھی پھر انھوں نے اپنی فوجیں جمع کر کے یہ کوشش کی کہ ہمارے کل ممالک کو ایک حملے میں تباہ کر دیں۔ اور اس علاقے کو بھی اپنی حکومت میں شامل کر لیں۔ لیکن انھیں

شکست ہوئی۔ اُن کا حملہ ختم ہو گیا اور ہرقل کے ستونوں کے اس طرف کے کل مالک کو اُن کے جوہر و قسم سے آزادی حاصل ہو گئی۔ اس کے چند روز بعد ہی یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک دن اور ایک رات میں بے شمار زلزلے آئے اور ایسا شدید سیلاب آیا کہ وہ ساری زمینیں غرقاب ہو گئیں۔ اور وہ جنگجو قوم سمندر کے اندر غرق ہو گئی۔ پورا جزیرہ آٹلانٹس ہمیشہ کے لیے سمندر کے اندر غائب ہو گیا۔ اور تب سے وہ عظیم الشان سمندر قابل عبور ہو گیا کیونکہ کوئی جہاز اُس میں نہیں چل سکتا۔ اُسکی وجہ یہ بھی ہے کہ جو جزیرے سمندر کے اندر غائب ہو گئے وہ سمندر کی سطح سے دو چار گز سے زیادہ گہرے نہ تھے۔ لہذا ایسے سمندر میں کوئی جہاز نہیں چل سکتا۔

جزائر آٹلانٹس والوں کا یہ حملہ بہت قدیم زمانے میں ہوا۔ اور اُس وقت تک شہر آتینہ بھی یونانی شہروں میں شامل نہ تھا۔ یونانیوں میں سالانہ ایک عید بھی منائی جاتی تھی جو اسی فتح کی یادگار تھی۔ قدیم یونانیوں میں یہ ایک بہت بڑی روایت تھی اور بہت دنوں سے چلی آتی تھی۔ یونانی حکیم ستولون بھی مصر جانے سے پہلے آٹلانٹس کا حال جانتا تھا۔ لیکن مصر پہنچ کر اُس کو سب سے پہلی مرتبہ اُس جزیرے کا مفصل حال معلوم ہوا اور اُس نے یہ بھی سنا کہ وہ جزیرہ کس خوفناک طریقے پر سمندر کے اندر غائب ہو گیا۔ دیگر قدیم مورخین بھی جزیرہ آٹلانٹس کا حال لکھتے ہیں۔ اس قسم کی قدیم روایتیں بحر اٹلانٹک کے دونوں جانب لوگوں میں مشہور ہیں۔ اور اب تک چلی آتی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ جزیرہ آٹلانٹس براعظم افریقہ کا ایک حصہ تھا جو سمندر میں بڑھتا ہوا افریقہ کے ساحل تک چلا آیا تھا بحر اٹلانٹک کے دونوں جانب کے قدیم باشندوں میں اسی روایت کا پایا جانا بلاوجہ نہیں

کہا جاسکتا۔ بلکہ اس کی کچھ نہ کچھ اصلیت ضرور ہوگی۔ قدیم یونانی مورخین اس سرزمین کو جسے وہ آٹلانٹس کہتے ہیں ہمیشہ یورپ اور افریقہ کے آگے اسی سمندر میں بیان کرتے ہیں جو انھیں جزائر کے نام سے اب تک مشہور ہے۔ اور قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس سمندر نے اپنے نام سے اُس قدیم زمانے کی تاریخی یادگار کو

اب تک لوگوں کے دلوں میں نہیں تو زبانوں پر زندہ کر رکھا ہے۔

یورپ کی کسی زبان میں اٹلانٹک کے کوئی معنی نہیں ہیں اور یہ لفظ یونانی یا ایرانی دنیا کی کسی دوسری زبان کا نہیں ہے۔ لیکن میکسکو کی زبان میں اٹل کے معنی پانی کے ہیں۔ اس سے اس زبان میں اور بھی بہت سے لفظ بنے ہیں مثلاً اٹلان کے معنی پانی کے رخ میں ہوا دوسری سے لفظ اٹلانٹک نکلا۔ گوئٹس نے جب براعظم امریکہ کو پایا تو غلطی آرا با کے دہانے پر اٹلان نام کا ایک شہر آباد تھا جہاں ایک اچھا بندرگاہ تھا۔ اب یہ شہر ویران ہو گیا ہے مگر ایک چھوٹی سی گم نام آبادی اٹلان نام کی اب بھی وہاں باقی ہے۔

امریکہ کے نقشے کو بغور دیکھنے سے ہمیں یہ معلوم ہو گا کہ دریائے آدری کو دہانے سے لے کر جزیرہ نماے فلوریڈا تک سمندر میں بہت سی چٹانیں ایسی ہیں جو سمندر کے مدیا طوفان کی وقت نہیں نظر آتیں۔ یہ ایک بہت بڑے کوہستانی سلسلے کی ادبھی چوٹیاں ہیں۔ وہ ہارڈ اور اس کی داویان پانی کے اندر چھپی ہوئی ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ یہ براعظم امریکہ کی خشکی کا ایک حصہ ہو جو اب سمندر کی سطح کے نیچے ہو گیا ہے۔ اور جس کی وجہ سے شمالی اور جنوبی امریکہ کے درمیان غلطی میکسکو بن گیا ہے

طبقات الارض کے ایک بڑے ماہر چارلس مارٹن کا یہ دعویٰ ہے کہ جو اتر اور سر۔ کنٹارینڈ اور قدیمہ اسی سرزمین کے حصے ہیں جو کسی زمانے میں آفریقہ کو امریکہ سے ملائے ہوئے تھے۔

سرزمین اٹلانٹس کی ان قدیم روایتوں کو اگر ہم کوئی وقت نہ دیں اور انہیں محض انسانی تخیلات کا ایک کرشمہ سمجھیں تب بھی ہم بعض دیگر اسباب ایسے ملتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ زمین کے ان دونوں بڑے حصوں میں بہت قدیم زمانے سے انسان کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا۔ اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ بہت ممکن ہے ایشیا اور شمالی امریکہ کسی زمانے میں ملے ہوئے ہوں۔ لیکن فرض کر لیجئے کہ ایسا کبھی نہ تھا۔ اس حالت میں بھی بہت ہی چھوٹی اور معمولی کشتیاں ایک براعظم سے دوسرے

براعظم تک بہت آسانی کے ساتھ پہنچ سکتی ہیں۔ جزائر اوشین کی وجہ سے یہ راستہ اور بھی آسان ہو جاتا ہے۔ پھر اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ ساحلی مقامات کے باشندے قدیم ترین زمانے سے سمندرون میں پھرنے کے عادی ہو رہے تھے اور ان کی زندگی محض سمندر کی پیداوار پر بسر ہوتی تھی۔ یہ انسان کی فطرت میں داخل کر دیا گیا ہے کہ وہ مصائب سفر کو خوشی سے برداشت کر لیتا ہے۔ بلکہ اس سے لطف اٹھاتا ہے۔ دریافت استعجاب اُس سے مشکل ترین کام بھی کر دیتا ہے۔ لہذا یہ بات تو قیاس میں نہیں آ سکتی کہ وہ ماہی گیر جو سمندر سے اس قدر ڈر ہو گئے تھے اس سرزمین سے ناواقف رہے ہوں جو تھوڑی ہی دور ان کے سامنے تھی یہ قرین قیاس ہے کہ ان ساحلی باشندوں نے ایک جزیرے سے دوسرے جزیرے میں سفر کیا ہو گا۔ اور ہر جزیرے کے مناظر بہ نسبت پہلے کے زیادہ دلچسپ ہونے کی وجہ سے انہیں اور آگے بڑھنے لگے ہوں گے یہاں تک کہ وہ دوسرے براعظم میں پہنچ گئے۔

انسان ہمیشہ اس کوشش میں لگا رہتا ہے کہ اپنی حالت کو پہلے سے زیادہ بہتر بنائے اور اس تلاش میں وہ اکثر دوسے زمین کے دور دراز ممالک میں نکل جایا کرتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ جو چیزیں بیان ہمارے امکان میں نہیں ہیں وہ دوسری جگہ جانیے سے یہ آسانی دستیاب ہو جائے گی۔ اس کی جچین طبیعت کسی حالت میں مطمئن نہیں رہتی۔ سیر و تفریح کا شوق بھی انسان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتا ہے۔ جب ہم ان باتوں پر غور کرتے ہیں تو یقین ہو جاتا ہے کہ انسان بہت ابتدائی زمانے میں ہی ایشیا سے شمالی امریکہ میں پہنچ گیا ہو گا۔ ایک مرتبہ وہاں پہنچ جانے کے بعد جنوب کی جانب سفر کر کے خوش گوار آب و ہوا کی تلاش میں امریکہ کے دونوں براعظموں میں پھیل جانا خلافت قیاس نہیں ہو سکتا۔

بعض اہل رائے اس پر یقین رکھتے ہیں کہ امریکہ میں سب سے پہلے بنی اسرائیل کے وہ قبیلے آئے آباد ہوئے جنہوں نے اپنے وطن کو خیر باد کہی

تھی مگر پھر تہ نہ چلا کہ وہ کہاں چلے گئے۔ اسٹوریادے جب بنی اسرائیل کو کپڑے لگے ہیں تو اس گز قناری کے زانے میں یا اس کے بعد ہی بنی اسرائیل کے دس یا بارہ قبیلے بالکل غائب ہو گئے۔ بہر حال تاریخ میں پھر ان کا کین نام و نشان نہیں ملتا۔ یہودی کی تاریخ میں ان کی نسبت عام طور پر یہی لکھا ہے کہ وہ گم ہو گئے۔ یقینی طور پر تو نہیں کہا جاسکتا مگر بہت ممکن ہے کہ وہی قبائل سفر کرتے کرتے شمالی ایشیا سے امریکہ میں داخل ہو گئے ہوں۔ شمالی ایشیا اور زیر شمالی امریکہ کا موسم بہت تکلیف دہ پاکر ان کا رخ قدرتی طور پر جنوب کی جانب پھرا گیا ہو گا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کے اس سفر میں کتنے سال گزر گئے ہوں۔ یہ ضرور ہے کہ وہ لوگ تکلیفیں برداشت کرنے کے ایسے عادی ہو چکے تھے کہ کسی ایسی خود شگوار اور پیمان جگہ کی تلاش میں جہاں انھیں مذہبی آزادی حاصل ہو اور جس جگہ ضروریات زندگی بہ آسانی ہم پہنچ سکیں انکا گھرنے اتنا بڑا سفر گوارا کر لیا ہو تو بعد از قیاس نہیں کہا جاسکتا۔

امریکہ کی آبادی کے متعلق جو کچھ ادب پر بیان کیا گیا ان میں سے بعض ضرور قرین قیاس ہیں۔ لیکن بعض امور اور بھی ہیں جن کی تردید کرنا آسان نہیں ہے۔ کولمبس نے جب جزیرہ سان سلوڈ پر قدم رکھا تو اس نے وہاں انسان کی ایک ایسی وحشی قوم دیکھی جو پرانی دنیا کے لوگوں سے بہت مختلف تھی۔ لیکن ایک چیز جو یہاں اور وہاں کے باشندوں میں یکسانی نمایاں کرتی تھی یہ تھی کہ ان لوگوں نے بھی کتوں کو شکار کے لیے سدرھا یا تھا۔ اور گھوڑے کے بعد کتا ہی انسان کا سب سے بڑا رفیق۔ ہمدرد اور مددگار ثابت ہوا ہے۔

کولمبس نے تو اس نئی دنیا میں فقط وحشی جانوں کو پایا تھا۔ لیکن اس کے پچیس ہی برس بعد اسپین کا ایک جانناز شخص کورٹیز سرزمین امریکہ کے بعض حصے دیکھنے گیا۔ میکسکو کے ساحل پر قدم رکھتے ہی اسے یہ دیکھ کے بڑا تعجب ہوا کہ وہاں ایک ایسی قوم آباد ہے جو باوجود اپنی ضعیف الاعتقاد پر ان کے تہذیب کے اعلیٰ مدارج طے کر چکی ہے۔

کورٹیز کے چند سال بعد پزارو نے امریکہ کے علاقہ پیرو کے اندرون

پچھلے میں سفر کیا۔ یہاں اُسے ایک ایسی قوم نظر آئی جو سیکسکو والون سے بھی زیادہ ہوشیار اور دولت مند تھی۔ یہ دونوں قومیں علوم و فنون میں کافی دستگاہ رکھتی تھیں اور غور کرنے سے ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ ان کے عقائد مصریوں اور قدیم ایرانیوں سے بہت کچھ ملتے جلتے تھے۔ ان کے حروف جو تعداد میں پچیس تھے۔ تقریباً سب کے سب یونانیوں اور شام والوں کے حروف سے بہت مشابہ تھے۔ ان کے سال کی مدت ہمارے سال کے برابر تھی۔ جناب میں وہ کسر اور اعشاریہ سے بخوبی واقف تھے اور ریاضی میں اتنی مہارت حاصل کر لی تھی کہ انھوں نے فن تعمیر میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ ان کے ان کاموں کو دیکھ کے ہمارے زمانے کے بہترین انجینیر بھی تعجب کرتے ہیں۔ اس قسم کی شہادتیں ہمیں اس بات کے ماننے پر مجبور کرتی ہیں کہ امریکہ کے قدیم باشندے مصریوں یا دیگر مشرقی قوموں سے ضرور کوئی خاص تعلق رکھتے تھے۔ یہ ترقی یافتہ قومیں اگرچہ امریکہ کے مغربی ساحل پر پائی گئیں مگر امریکہ کے دیگر مقامات میں بھی قدیم تہذیب کے آثار بخوبی ملتے ہیں۔

اب ہم اس پر غور کرتے ہیں کہ جنوبی امریکہ میں مغرب کی جانب سے انسان پہنچ سکا ہو یا نہیں۔ بظاہر تو یہ بہت مشکل معلوم ہوتا ہے کیونکہ اتنا وسیع سمندر درمیان میں حائل ہے۔ لیکن غور کرنے سے اسکاں کی صورت نظر آنے لگتی ہے۔

بحرالکابل کے جزائر میں دو قسم کے جہاز بہت قدیم زمانے سے پائے جاتے ہیں جو دور و دور از سمندرون میں جا سکتے تھے۔ ایک قسم کے جہاز جاپان والوں کے یہاں بنائے جاتے تھے اور دوسری قسم ٹونگا اور سوسائٹی کے جزائر میں پائی جاتی تھی۔ کوکبیس سے بہت پہلے اہل فیثیتیم نے ان سے بہت چھوٹے اور کمزور قسم کے جہاز دن میں بہت بڑے بحری سفروں کی جرات نہی تھی۔ جزائر ٹونگا کے باشندے قدیم ترین زمانے سے جزائر ساموا، فجی اور نیو ہیبرڈیز میں آتے جاتے تھے جو ایک دوسرے سے بہت فاصلے پر ہیں۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ دور و دور از جزائر میں

اُن کی آمد و رفت تھی۔ یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ بحر الکابل کے کل جزیرہ دن میں ایک دوسرے سے آمد و رفت تھی۔ ان جزائر کے باشندوں کی نسبت یہ بات بھی اب قطعی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ قدیم ترین زمانے میں بھی وہ بڑے مشاقی جہاز ران تھے۔ اپنی کشتیوں یا چھوٹے چھوٹے جہازوں کو اس بحرِ ناپیداکنار میں ڈال دیتے تھے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ کھلے سمندر میں وہ ساروں کے ذریعہ اپنا راستہ قائم رکھتے۔ مگر بڑے ماہرین کی سمجھ میں بھی یہ بات پوری طرح نہیں آ سکی ہے کہ وہ جہاز رانی میں دراصل کس علم سے کام لیتے تھے۔

جزائرِ ایسٹرمین جو جنوبی امریکہ سے ڈیڑھ دو ہزار میل کے فاصلے پر واقع ہیں پھر کے بہت سے بت دستیاب ہوئے ہیں جن کے چہرے جزائرِ ملایا کے اصلی قدیم باشندوں سے بہت مشابہ ہیں۔ اس سے یہ امر یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ جزائرِ ملایا والے سمندر میں اتنی دور و غور درہی کل جاتے تھے۔ اور جب دو ڈیڑھ ہزار میل کھلے سمندر میں جاسکتے تھے تو کوئی وجہ نہیں کہ جزائرِ ایسٹرمین کے اور آگے ڈیڑھ دو ہزار میل نہ جاسکے ہوں۔ یا اُنھوں نے اور آگے بڑھنے کی حرات نہ کی ہو۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قدیم زمانہ میں جزائرِ ملایا والوں کی ایک عظیم الشان سلطنت قائم تھی۔ اور بحر الکابل کے کل جزیرے اسی حکومت کے تابع فرمان تھے جس وقت اس سلطنت کی ابتدا ہوئی اُس پر زمانہ ماقبل تاریخ کی روایتوں کا پردہ بڑا ہوا ہے۔ اکثر قدیم سیاح اپنے سفراؤں میں اس عظیم الشان سلطنت کا حوالہ دیتے ہیں۔ ایک سیاح جو بڑا قابلِ شخص ہے لکھتا ہے کہ اس بادشاہ کے زیر اثر بے شمار جزیرے ہیں۔ نہایت تیز چلنے والے جہاز پورے دوسریں میں بھی اُن کے گرد گھوم کے نہیں آ سکتے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ قدیم سلطنت اُن سب جزائر پر حاوی ہو گئی جو بحر الکابل میں واقع ہیں۔ وہی سیاح یہ بھی بتاتا ہے کہ اس سلطنت نے جہاز رانی میں بڑی ترقی کی تھی۔ وہاں جہازوں کے بہت سے بیڑے تھے۔ اور بشمار جہاز تجارتی مال لاتے اور لے جاتے تھے۔ وہاں کے لوگوں نے صنعت و حرفت میں بھی خاصی ترقی کی تھی۔ بہت سا مال خود اُن کے بیان بنتا تھا جسے وہ جہازوں کے ذریعے دوسرے مالکین لے جاتے پھرتے تھے۔

اُن کے زیرِ اور سکتے چاندی سونے کے تھے۔

اس عظیم الشان سلطنت کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ جزائر آسٹریلیا میں جو بہت دور سمندر میں واقع ہوئے ہیں ملائی زبان کے الفاظ ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ جزائر بحر الکاہل کی زبانیں آپس میں اتنی ملتی جلتی ہیں کہ مختلف جزائر کے لوگ ایک دوسرے کی زبانیں بہ آسانی سمجھ لیتے ہیں۔ یہ آسی ملائی سلطنت کے اثر سے ہوا۔ اس وسیع سلطنت کا صدر مقام جزیرہ جاوا میں موجودہ شہر جکے دیا سے تقریباً تیس میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ اب بھی اُس کے کھنڈر باقی ہیں جن پر ایسی شان اور فنِ تعمیر کی ایسی مہارت نمایاں ہوئی ہے کہ آج کل کے لوگ اُسے دیکھ کے حیران رہ جاتے ہیں۔

ان سب کے سوا ایک اور خیال بھی پیدا ہوتا ہے اہلِ فنیقہ پرانے زمانے میں بڑے جہاز ران تاجر گزرے ہیں۔ ان کا صدر مقام ارض مقدس کا ساحلی شہر طائٹ تھا جو کسی زمانے میں بڑا آباد اور بارونتی شہر تھا۔ یہ لوگ جہاز رانی میں بڑے شوق گزرے ہیں۔ روم اور قرطاجہ کے کل علاقہ جات میں انھیں کے جہاز مال و اسباب لاتے اور لے جاتے تھے۔ ان کے جہاز بحرِ روم کے اندر بھی نہیں چکر لگاتے رہتے تھے بلکہ آبنائے جبرالٹر کے باہر سمندر میں بھی چکر لگاتے تھے اور آفریقہ کے مغربی ساحل پر دور دورہ اتر مالک تک پہنچ جایا کرتے۔ ان جہاز رانوں کا اتنا حال تو ہم کو یقینی طور پر معلوم ہے مگر کیا یہ ممکن نہیں کہ اپنی تجارت کو پھیلانے کے خیال سے اُنھوں نے اور آگے بڑھ کے کھلے سمندر میں چکر لگائے ہوں اور بہت ممکن ہے کہ امریکہ کے ساحل تک پہنچ گئے ہوں مگر یہ صرف قیاس ہے اس کے متعلق کوئی یقینی بات نہیں کہی جاسکتی۔

یہ سب صورتیں اس کی ہیں کہ امریکہ میں انسان کس طرح پہنچ سکا ہوگا۔ اصل یہ ہے کہ صحیح طور پر کوئی نہیں بتا سکتا کہ امریکہ میں انسان کیسے جانے آباد ہوا۔ مگر یہ ضرور ہے کہ انھیں میں سے کوئی نہ کوئی صورت ہوئی ہوگی۔ اسپین میں جب عربوں کی حکومت تھی تو اس زمانے میں بھی بعض من چلے ملاحوں نے سمندر میں بہت دور تک چکر لگایا تھا اور کسی نامعلوم

زمین کی تلاش میں بہت دور تک نکل گئے تھے مگر ان کی ہم کامیاب نہیں ہوئی اور انھیں واپس آنا پڑا۔ اس کا حال مشہور ہسپانی مورخ کانڈی نے اپنی تاریخ ہسپانیہ عرب میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یورپ والوں میں اٹلانٹک کے اس پار کسی زمین کے موجود ہونے کا خیال پہلے سے ضرور موجود تھا۔

آمریکہ میں انسان کے پہنچ جانے کے بعد پھر اس دنیا سے تعلقات منقطع ہو گئے تھے۔ اور کسی کو اس دنیا کا حال نہیں معلوم تھا۔ مسئلہ عیسوی کے قریب تا زین لوگوں نے جہاز رانی میں ترقی کی اور سمندر و زمین دور دور تک نکل گئے۔ یورپ سے وہ جزیرہ آئیس لینڈ میں گئے۔ اور وہاں سے گرین لینڈ میں پہنچے۔ اور وہاں اپنی ایک نوآبادی قائم کر لی۔ گرین لینڈ سے امریکہ کے ساحل کچھ دور نہیں ہیں۔ اور ان کے تجارتی جہاز امریکہ میں بھی جانے آئے گئے تھے۔ اس کی زیادہ تر یہ وجہ تھی کہ گرین لینڈ میں اکثر برف جمی رہتی۔ اور درخت بہت بڑے نہیں ہو سکتے تھے۔ لہذا وہاں مکان بنانے کے لیے لٹھوں کی ضرورت پڑتی جو امریکہ سے لائے جاتے۔ کیونکہ وہاں گھنے جنگل کی کوئی کمی نہ تھی۔ اور لکڑی بے افراط پیدا ہوتی۔ گرین لینڈ سے یہ لوگ جاکے امریکہ سے لکڑیوں کے لٹھے لے آتے۔ پھر ان تار میں لوگوں نے امریکہ کے ساحل پر بھی اپنی ایک نوآبادی قائم کر دی تھی۔ مگر امریکہ کے قدیم باشندوں نے انھیں وہاں نہیں ٹھہرنے دیا اور چند سال کے بعد ان میں لوگ جو امریکہ کے ساحل پر بس گئے تھے اُس سرزمین کو چھوڑ کے گرین لینڈ اور آئیس لینڈ ہوتے ہوئے یورپ کے ممالک تاروے اور ڈمارک میں واپس چلے آئے۔

لہذا کوئیس پہلا شخص نہیں ہے جس نے امریکہ کو معلوم کیا۔ اس سے پہلے انسان تو وہاں پہنچ ہی چکا تھا۔ اور روئے زمین کے ان دو حصوں میں تعلقات منقطع ہو جانے کے بعد بھی بعض لوگ وہاں پہنچ چکے تھے جیسا کہ تار میں لوگوں کے حال میں بیان کیا گیا۔ بہت ممکن ہے کہ کوئیس نے یہ قدیم افسانے سننے میں اور انھیں کی بنا پر اسے اس یقین کے ساتھ اتنی دور زمین جان کی جرأت ہوئی ہو۔ اتنا ضرور ہو کہ اگر اسے کچھ معلوم تھا تب بھی اس نے بہت بڑی جرأت کی جس کی جہڑا سکنا ہم شبہ یا رہے گا۔

قسمت کی نیرنگی

اندلس کے آخری اسلامی دور حکومت بن شاہ یوسف بن محمد غناط کے تاج و تخت پر بیٹھا ہوا حکومت کر رہا تھا۔ اس کے چار بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے کا نام اُس نے خود اپنے نام پر یوسف رکھا۔ منجھلے بیٹے کا نام محمد تھا۔ منجھلے علی اور چھوٹے کا نام احمد تھا۔ بادشاہ یوسف کا منجھلا بیٹا محمد بن یوسف بڑا بہادر اور میخلا جان تھا۔ اس میں تیزی اور حوصلہ مندی کے جذبات بھی موجود تھے۔ اس نے دیکھا کہ بڑے بھائی یوسف کو محمد پر ترجیح دی جاتی ہے۔ اور محض بڑے ہونے کی وجہ سے اُسے یہ حق حاصل ہو گیا ہے۔ حالانکہ میں اس سے زیادہ قابل اور بہادر ہوں۔ پھر بادشاہ بھی اسی کو چاہتا ہے اور اسے ولی عہد مقرر کر دیا ہے۔ محمد بن یوسف کی منجھلی طبیعت نے اسے گوارا نہ کیا اور اس نے ارادہ کیا جس طرح ممکن ہو مجھے تاج و تخت حاصل کرنا چاہیے۔

اس جوش میں اُس نے بادشاہ یعنی اپنے باپ کی بھی پروا نہ کی اور مخالفت پر آمادہ ہو گیا۔ اندلس میں مسلمانوں کی حالت رو بہ تنزل تھی اور فتنہ و فساد کے لیے صرف بہانہ کافی ہوتا تھا۔ بہت سے لوگ اُسکے طرف راہ ہو گئے۔ شہر کے عوام اور وہ غیر مطمئن لوگ جو ہمیشہ ایسے موقعون پر اٹھ کھڑے ہوا کرتے ہیں اس دفعہ بھی شہزادہ محمد کے ساتھ ہو گئے۔ اور یہ بے اطمینانی کی حالت قائم رہی۔ شاہ یوسف نے انتقال کیا جس کا واقعہ بھی عجیب و غریب ہے۔

قاس کے بادشاہ نے شاہ یوسف کے پاس چند قیمتی ہریے بھیجے اور ان میں ایک نہایت ہی بھاری زربفت کا جوڑا بھی تھا۔ اصل میں قاس کا بادشاہ یوسف سے دشمنی رکھتا تھا۔ لہذا اس جوڑے کو ایک نہایت تیز فتنہ کے زہر میں تر کر کے خشک کر لیا گیا تھا۔ بادشاہ یوسف نے ایک دفعہ اس جوڑے کو پہنا تو اُسکے سارے جسم میں درد پیدا ہو گیا۔ اور اسی تکلیف سے اس نے اپنی جان دی۔ کوئی دوا کارگر نہ ہوئی۔

شاہ یوسف کے منجھلے بیٹے محمد نے اسی دن کے لیے سازشوں اور مکاریوں کا جال بچھا رکھا تھا۔ باپ کے مرتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کل شیوخ و امرا اُس کے طرفدار ہو گئے۔ کسی نے شہزادہ یوسف کے حقوق کا لحاظ نہ کیا اور شہزادہ محمد کو زیادہ حست و چالاک اور بہادر دیکھ کے سب اُسی کو طرفدار ہو گئے۔ اُنھوں نے اسی منجھلے بیٹے کی حکومت کا اعلان کر دیا اور وہ تخت سلطنت پر بیٹھ گیا۔

محمد بن یوسف کو تخت پر بیٹھتے ہی سب سے پہلے یہ فکر ہوئی کہ اپنے بڑے بھائی یوسف کو گرفتار کر لے۔ وہ شہزادہ اپنی قسمت پر قانع ہو کے گھر میں خاموش بیٹھ رہا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ اس طرح خاموشی اور امن کے ساتھ اپنی زندگی کے دن پورے کر دے۔ اس خیال سے وہ نہ اپنے گھر سے باہر نکلا۔ نہ انقلاب پسند لوگوں سے ملا۔ اور نہ اُنھیں کسی قسم کی ترغیب دی۔ مگر اُس کا چھوٹا بھائی اُسے آزاد نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ لہذا اسے گرفتار کر کے قلعہ شلو بانیہ میں بھیج دیا اور حکم دیا کہ اس کی نہایت سختی کے ساتھ نگرانی رکھی جائے۔ مگر اسے کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے جس چیز کی اُسے ضرورت ہو فوراً امتیاز کر دی جائے۔ اس حکم کے مطابق وہ شہزادہ اپنے حرم اور لونڈی غلاموں کے ساتھ اس قلعے میں پہنچا دیا گیا۔

کئی سال اسی حالت میں گزر گئے۔ شاہ محمد بن یوسف غرناطہ پر حکومت کرتا رہا۔ آخر وہ بیمار ہوا اور اُس کا مرض اس حد تک پہنچ گیا کہ طبیبوں نے جواب دیدیا۔ اُنھیں نظر آیا کہ اس بیماری کا نتیجہ سوا موت کے اور کچھ نہ ہوگا۔ خود محمد بن یوسف کو اپنی زندگی کی امید نہیں باقی رہی۔ اُسے یہ خیال کر کے بہت رنج ہوتا کہ میرے بعد میرا بیٹا بھائی تخت و تاج کا مالک ہوگا۔ اور میری اولاد اس سے محروم رہے گی۔ لہذا ارادہ کیا کہ یوسف بن یوسف کو قتل کرانے اس قلعہ شلو بانیہ کے قائد کو ایک خط لکھا اور اپنے معتبر خادم رئیس احمد بن مشرق کے ہاتھ اس کے پاس بھیجا۔ اس

خط میں لکھا تھا۔ میرے وفادار خادم قلعہ شلو بانیہ کے قائد جیسے ہی زمین
رئیس احمد بن شرق کے ہاتھ سے یہ خط ملے تم پر لازم ہے کہ میرے بھائی
یوسف کو قتل کر ڈالو۔ اور اسی قاصد کے ہاتھ ان کا سر کاٹ کے
میرے پاس بھیج دو۔ دیکھو میری وفاداری میں تم سے کوتاہی نہ ہونے
پائے۔

رئیس احمد بن شرق یہ خط ملنے کے قلعہ شلو بانیہ میں پہنچا۔ اس وقت
شہزادہ یوسف قلعہ کے قائد کے ساتھ شطرنج کھیل رہا تھا۔ شہزادہ یوسف
کے لیے اس کے رتبے کے مطابق ہر قسم کا سامان عیش بہم پہنچا دیا گیا تھا۔
اور اس کی بڑی عزت کی جاتی تھی۔ وہ اس وقت نہایت پر تکلف قالینوں
پر بیٹھے تھے اور کار جو بی تکیے رکھے ہوئے تھے۔ قائد نے بادشاہ کا خط
پڑھا تو اسے بڑا صدمہ ہوا۔ اور اس کے چہرے سے رنج و افسوس
ظاہر ہونے لگا۔ جو شخص شہزادہ یوسف سے ملتا اس کی نیکی اور اعلیٰ صفات
کی وجہ سے اس کی قدر کرنے لگتا۔ اس قائد کو بھی اس کے ساتھ رہنے
سننے کی وجہ سے بڑی محبت ہو گئی تھی۔ لہذا قائد نے جیسے ہی شاہ محمد
ابن یوسف کا خط پڑھا اس کا دل بیٹھ گیا۔

رئیس احمد بن شرق جو یہ خط لایا تھا اس حکم کی تعمیل کرنا چاہتا
تھا۔ اس نے قائد سے کہا کہ بادشاہ کا یہ حکم بالکل قطعی ہے اور اس کی تعمیل
میں تاخیر نہ کی جائے۔ مگر قائد کا دل اب بھی اس بات کو کسی طرح نہیں
گوارا کرتا تھا کہ ایسے ظالمانہ اور برسرچی کے حکم کو شہزادہ یوسف کے قانون
تک پہنچائے۔ لہذا وہ خاموش بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کیا کرے۔ شہزادہ یوسف
ان باتوں سے سمجھ گیا۔ اور قائد کے چہرے کی پریشانی اور اضطراب دیکھ کے
اس نے پوچھا کہ کیا بادشاہ نے میرے قتل کا حکم دیا ہے۔ جو آپ اس قدر
پریشان نظر آتے ہیں؟ قائد نے زبان سے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ بادشاہ
کا خط شہزادہ کے ہاتھ میں دے دیا۔ اسے پڑھ کے شہزادہ یوسف نے کہا
”اچھا مجھے چند گھنٹوں کی اجازت دیجیے تاکہ اپنے خاندان والوں سے رخصت

ہولوں۔ اور اپنے پس ماندوں کو آخری مرتبہ اپنے ہاتھ سے ہیے دیدوں
مگر احمد بن شرق نے جواب دیا کہ بادشاہ کے حکم کی تعمیل میں ذرا سی بھی دینے
نہیں کی جاسکتی۔ میرا وقت مقرر کر دیا گیا۔ میرے یہاں تک آنے اور واپس جانے
کا پورا حساب لگا کے مجھے بتا دیا گیا ہے کہ فلان وقت تک واپس پہنچ جانا
چاہیے۔ شہزادے نے کہا خیر تو ہمیں یہ بازی تو ختم کر لینے دو۔ مگر یقین ہے
کہ اب میں ہی ہاروں گا۔ کھیل پھر شروع ہوا مگر قائد کا دل اس قدر متاثر
ہو گیا تھا کہ وہ کوئی مہر بغیر غلطی کیے نہ چل سکتا۔ اور شہزادے نے کئی دفعہ
اسے توجہ دلائی۔

اب خدا کی قدرت اور قسمت کی نیرنگی دیکھیے کہ وہ بازی ابھی
ختم نہ ہونے پائی تھی کہ دو شہسوار اپنے گھوڑے دوڑاتے ہوئے غناطہ کی
جانب سے آئے۔ اور شاہ احمد بن یوسف کے انتقال کی خبر دی۔ شہزادہ یوسف
کو اپنی بد قسمتی کی بدولت ابھی اس کا یقین نہ آتا کہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔
مگر گھوڑی دیر میں دیگر عزیزین اور امرا بھی آ پہنچے۔ اور انھوں نے بھی اس
خبر کی تصدیق کی جو پہلے دونوں شہسواروں نے پہنچائی تھی۔ اس کے بعد سب
لوگ بیان سے خوشی خوشی نکلے اور نہایت تیزی کے ساتھ دارالسلطنت کی
جانب چلے۔ غناطہ میں یوسف کا بڑے جوش و خروش کے ساتھ استقبال
ہوا اور وہ تخت سلطنت پر بٹھا دیا گیا۔

بیداری

ازخواب مولوی غلام طیب صاحب بی اے بی ٹی
مددگار عثمانیہ کالج اورنگ آباد دکن

کل نہ تھا یہ درد دل میں اور یہ الجھن نہ تھی مجھ کو ترپاتی کسی کی بوسے پیرا ہن نہ تھی
شمع کے جلنے پہ میں آتش بجان ہوتا نہ تھا رقص پروانہ پہ دل کا امتحان ہوتا نہ تھا
یہ نہ آوارہ خیالی تھی نہ آوارہ نظر قلب تھا نا آشنائے شہزاد بال و پیر

رات کی ٹھنڈی ہواؤں میں مجھے آتی تھی نیند
صبح دم جب آج چڑیاں آشیانوں سے اٹھیں
صبح نے ہر سمت چھیڑا جبکہ ساز سہری
آسمان پر جبکہ شب بیدار سے سو گئے
جب دعاؤں کے لیے باب اجابت کھل گیا
صبح سے جب رات بل بل کر جدا ہونے لگی
سبزہ خواہیدہ جب مستی میں لہانے لگا
جبکہ قطرے اوس کے آنکھوں میں گھر کرنے لگے
ایک صورت کی طرف کھینچنے لگی میری نظر
بیرے دل میں یکا یک کچھ گدگدی ہونے لگی
سارے پردے اٹھ گئے منظر نظر آنے لگے
جو شجر خاموش تھے اب گفتگو کرنے لگے
بند دل کے کھل گئے چشمے نئے بننے لگے

عشق تو نے اک نظر میں کیا تماشا کر دیا
دل کو صبحا کر دیا آنکھوں میں دریا بھر دیا

قدر دانان دگداز

دگداز کی اشاعت میں اس مرتبہ غیر معمولی تاخیر ہو گئی ہے۔ لیکن آئندہ
کے لیے اہتمام کر لیا گیا ہے کہ ہر سالہ وقت پر شائع ہوا کرے۔ ان رسالوں
کے پو پختے کے بعد انشاء اللہ بقیہ رسائل بھی جلد ہی پونچ جائیں گے۔ اور
کوشش کی جائے گی کہ دسمبر کا پرچہ اپنے وقت پر شائع ہو۔

خاکسار حکیم سراج الحق منہج دگداز



عربوں کے زمانہ حکومت اسپین میں جن لوگوں نے بڑا نام پیدا کیا ان میں ایک زریاب بھی ہیں۔ ان کا پورا نام ابوالحسن علی بن نافع تھا۔ اور لقب زریاب تھا۔ مگر یہ لقب اس قدر مشہور ہوا کہ لوگ اصلی نام بھول گئے۔ سب اسی لقب سے انھیں یاد کرتے تھے۔

زریاب دراصل بغداد کے رہنے والے اور ایرانی نسل سے تھے۔ انھوں نے موسیقی میں بڑا نام پیدا کیا جس کی تعلیم انھوں نے ہارون رشید کے دربار کے مشہور مغنی ابواسحق بن یوسف سے پائی تھی جو اپنے زمانے کے بالکمال استاد تھے۔ آخر میں زریاب اپنے استاد سے بھی بڑھ گئے۔ اور ان سے زیادہ شہرت حاصل کی۔ زریاب فقط موسیقی کے ماہر نہ تھے بلکہ ہر قسم کے علوم و فنون میں انھیں کافی دستگاہ حاصل تھی۔ اور ان کی قابلیت مسلم تھی۔ مگر موسیقی میں خاص کر انھیں کمال حاصل تھا۔

ایک دن ہارون رشید نے اسحق سے کہا کہ کسی نئے شخص کا گانا سناؤ اسحق نے عرض کیا کہ میرا ایک شاگرد ہے جو بہت اچھا گانے لگا ہے۔ اور میں نے اس کے ساتھ جو محنت کی ہے بیکار نہیں گئی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ میرا نام روشن کرے گا۔ رشید نے حکم دیا کہ اسے فوراً حاضر کرنا۔ زریاب شاہی دربار میں پہنچے اور یہ ایسے حریفین کے سامنے تھے کہ خلیفہ حیران رہ گیا۔ خلیفہ نے پوچھا کہ تم موسیقی جانتے ہو؟ زریاب نے جواب دیا کہ میں معمولی گانا بھی جانتا ہوں مگر اُس کے پاس ہوا

مجھ میں ایک ایسا کمال موسیقی بھی موجود ہے جس سے اور سب لوگ ناواقف ہیں۔ اور وہ محض آپ کے ایسے قدر و امان فن کے کاؤن کے لیے مخصوص ہیں۔ آپ کہیں تو میں اسی طرح کاؤن جس طرح اور سب لوگ گاتے ہیں ورنہ اس خاص طریقے سے گاؤں جسے اب تک کسی کے کاؤن نے نہیں سنا ہے۔ خلیفہ نے حکم دیا کہ ابو اسحق کا سرود تر یا ب کو دیا جائے۔ مگر تر یا ب نے کہا کہ میں خاص اپنے سرود پر گانا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ خلیفہ نے تعجب سے پوچھا کہ تم اپنے استاد کے سرود کو بھی نہیں پسند کرتے؟ تر یا ب نے عرض کیا کہ اگر آپ میرے استاد کا ایسا گانا سنا جائے تو میں استاد ہی کے سرود پر گاؤں۔ لیکن اگر آپ خاص میرا گانا سنا جاتے ہیں تو مجھے اپنے ہی سرود پر گانے کی اجازت دیں۔ خلیفہ نے تر یا ب کا سرود لے کر دیکھا اور کہا کہ یہ بھی اسحق کا سرود ہے۔ تر یا ب نے کہا کہ بظاہر دونوں ایک ہی جیسے ہیں مگر میرا سرود اول تو بہت ہلکا ہے دوسرے اُس کے تار ریشم کے ہیں جو خاص طور پر بنائے گئے ہیں پھر اس میں کئی اور باتیں بھی ہیں۔ سرود میں عام طور پر چار تار ہوا کرتے ہیں میں نے ایک تار اور بڑھا دیا ہے جس سے بڑا فائدہ ہو گیا ہے۔ اور لکڑی کی کھونٹوں کے بجائے عقاب کے نیچے لگائے ہیں جس سے آواز بہت بلند اور صاف نکلتی ہے۔ اس کے بعد تر یا ب نے گانا شروع کیا۔ یہ خلیفہ بارون رشید کی شان میں ایک قصیدہ تھا۔ خلیفہ نے سنا تو واقعی اُس پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ اس کی روح وجد میں آنے لگی۔ اور وہ بے اختیار ہو گیا۔ گانا ختم ہونے کے بعد خلیفہ نے اسحق سے کہا کہ تم نے ایسے بالکمال شخص کو اب تک میرے سامنے کیوں نہ پیش کیا۔ اسحق نے کہا حضور اب تک میں خود ان کے اس غیر معمولی کمال سے بے بہرہ تھا۔ اور اسحق نے یہ بالکل سچ کہا کیونکہ تر یا ب نے اپنا یہ جو ہر ذاتی اب تک اسحق سے پوشیدہ رکھا تھا۔

مگر اسی وقت اسحق کے دل میں حسد کی آگ روشن ہو گئی اور گھر پہنچتے ہی تر یا ب سے کہا کہ تم نے مجھے بڑا دھوکا دیا۔ اپنے غیر معمولی

ہنس کر مجھ سے چھپائے رکھا۔ اور اس وقت جبکہ خود میں نے تھیں بارگاہ خلافت میں نے جا کر پیش کیا تو اس کمال کو ظاہر کر کے اس سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ میں تم سے صاف صاف کہہ دیتا ہوں کہ مجھے تم پر حسد آتا ہے کیونکہ میرا پیشہ وہی ہے جو تمہارا ہو گا۔ اور میں یہ نہیں دیکھ سکتا کہ اس فن میں کوئی مجھ سے زیادہ عزت اور نام پیدا کرے خواہ وہ میرا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ اب خلیفہ کو تمہارا گانا پسند آ گیا ہے۔ اور تم بیان رہے تو خلیفہ کی ساری عنایتیں تمہاری جانب مبذول ہو جائیں گی اور میں کس میرسی کے عالم میں پڑا رہوں گا۔ میرا جی تو یہ چاہتا ہے کہ اسی وقت تم کو قتل کر ڈالوں مگر تم میرے شاگرد ہو لہذا رحم آ جاتا ہے۔ اب سن لو اور اپنے لیے ان دو صورتوں میں سے کوئی بات اختیار کر لو۔ ایک تو یہ کہ اسی وقت بغداد سے روانہ ہو جاؤ اور کسی دور دور از ملک کا راستہ اختیار کر دو۔ اور اس کی قسم کھاؤ کہ پھر کبھی بیان نہ آؤ گے۔ اس صورت میں میں تھیں ضروری سامان اور کچھ روپیہ فراہم کر دوں گا۔ دوسری صورت تمہارے بیان ٹھہرنے کی ہے تو یہ جان لو کہ میں تمہارا سخت ترین دشمن بن رہا ہوں گا اور تھیں تباہ و برباد کر کے قتل کر دینے میں بھی دریغ نہ کروں گا خواہ اس کا نتیجہ بعد میں کچھ ہی ہو۔ اب تم ان دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت اسی وقت اختیار کر لو۔

تریا ب نے فوراً اسے قائم کر لی اور اپنے لیے پہلی صورت پسند کی۔ اسلحہ سے ضروری سامان سفر لیا۔ اور بغداد سے چل نکلا ہوا۔

چند روز بعد خلیفہ ہامدون رشید نے پھر تریا ب کو یاد کیا۔ اور اسلحہ سے کہا کہ اپنے اسی شاگرد کو بلاؤ۔ اسلحہ نے جواب دیا کہ حضور وہ شخص تو اس قابل نہیں کہ شاہی دربار میں بلایا جائے۔ وہ تو مجنون ہو گیا ہے۔ کہتا ہے کہ رات کو مجھے جہنم آئے گا۔ اسکا کیا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اس قدر مغرور ہو گیا ہے کہ دنیا میں کسی کو اپنے برابر نہیں سمجھتا حضور نے اس دن بلا کے اسے گانا سنا تھا مگر اسے نہ انجام دیا اور نہ اس کی عزت افزائی فرمائی اس پر وہ ناراض ہو کر کہیں چلا گیا۔ اب نہیں معلوم

کہاں ہے۔ گر مین تو خدا کا شکر کرتا ہوں کہ حضور کو اس دیوانے شخص سے نجات مل گئی۔ بعض اوقات جب اُس پر دیوانگی کا دورہ ہوتا ہے تو اس کی صورت بڑی خوفناک ہو جاتی ہے۔ اور دیکھ کے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ یہ سن کر خلیفہ کو اس نوجوان معنی کے چلے جانے کا بڑا افسوس ہوا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ شخص استغنی سے بھی زیادہ باکمال معنی ہوگا۔

اصل یہ ہے کہ جو کچھ استغنی نے خلیفہ کے روبرو بیان کیا تھا اس کی اصلیت ضرور تھی۔ تہہ زیاب یہ اکثر کہا کرتے تھے کہ مین سوتے مین جنون کے گیت سنا کرتا ہوں اور رات کو جن آ کر مجھے ایک نئی دھن سکھا جاتے ہیں۔ بعض اوقات وہ سوتے سوتے چونک پڑتے۔ بستر پر اٹھ کے بیٹھ جاتے اور اپنی لونڈیوں غزالہ اور ہندہ کو پکارتے۔ اُن سے کہتے کہ اپنے مرد لاؤ پھر اُنھیں وہی نغمہ سکھا دیتے جو سوتے مین سنا تھا۔ اور اُن اشعار کو لکھ لیتے۔ اور سو جاتے۔ استغنی بہ خوبی جانتے تھے کہ اُن کی یہ حرکت دیوانگی پر مبنی نہ تھی۔ ہر سچے ہنرمند کو خواہ وہ اجنبہ کا قابل ہو یا نہ ہو بعض ایسے لمحات ضرور پیش آئے ہیں جب کہ وہ غیر معمولی اور ناقابل بیان جذبات کے تابع ہو گیا ہے۔ اور اُس کی تشریح خود اس کے اختیار میں بھی نہیں رہی ہے۔ اور یہ ایک مافوق العادوت چیز ہوتی ہے خود استغنی الموصلی کی نسبت پیشہو ہے کہ اُن کا مخصوص نغمہ اُنھیں کسی جن نے آ کے سکھا یا تھا۔

تہہ زیاب ارض مغرب کی جانب چلے۔ افریقہ میں پہونچ کر اُنھوں نے اسپین کے بادشاہ الحکم کو لکھا اور اس کے دربار میں حاضر ہو کر وہیں قیام کرنے کی اجازت چاہی۔ تہہ زیاب کی شہرت ارض مغرب اور اسپین میں پہونچ چکی تھی۔ اسپین کے سلمان اب وہ سادے مزاج عرب نہیں رہے تھے۔ جنھوں نے آتے ہی ایک محلے میں سارے اسپین کو فتح کر لیا تھا۔ اب اُن میں دولت مندی کے ساتھ عیش و عشرت کی خواہشیں بھی پیدا ہو چلی تھیں۔ الحکم نے جب تہہ زیاب کا یہ خط پایا تو بہت خوش ہوا۔ اُس نے تہہ زیاب کو لکھا کہ آپ فوراً افریقہ میں آ جائیے۔ اور یہیں رہیے۔ مین آپ کے رہنے

سننے کا مناسب بندوبست کروں گا۔

ترریاب اپنے بال بچوں کو لے کر افریقہ سے روانہ ہوئے۔ اور آبنائے جبرالٹر کو پار کر کے اسپین میں داخل ہوئے۔ الجزائرہ میں جہاں سے اترتے ہی اُنھیں معلوم ہوا کہ شاہ الحکم کا انتقال ہو گیا۔ اس خبر سے انھیں بڑی مایوسی ہوئی اور ارادہ کیا کہ افریقہ میں واپس چلے جائیں۔ الحکم نے اپنے دربار کے یہودی مطرب منصور کو ترریاب کے استقبال کے لیے الجزائرہ میں بھیج دیا تھا۔ وہ ترریاب سے ملا۔ اُنھیں واپس جانے سے روکا اور یقین دلایا کہ الحکم مرحوم کا بیٹا اور جانشین عبدالرحمن بھی اپنے باپ کی طرح موسیقی کا شائق اور قدردان ہے۔ قرطبہ پہنچتے ہی وہ آپ کو ہاتھوں ہاتھ لے گا اور آپ کو خوش رکھے گا۔ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ منصوبہ کا خیال صحیح تھا۔ عبدالرحمن کو ترریاب کے آنے کی خبر ہوئی تو بڑے شوق کے ساتھ اپنے دربار میں بلا بھیجا۔ الجزائرہ سے قرطبہ تک راستے کے کل قائم وون کو حکم دیدیا کہ ترریاب کی ضرورتوں اور آرام و آسائش کا خیال رکھیں اور عزت و توقیر کے ساتھ قرطبہ تک پہنچا دیں۔ یہودیوں کے ایک خواجہ سرا کے ہاتھ بہت سے تحفے اور خراج و سواریان بھیج دیں تاکہ کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے۔

قرطبہ میں پہنچ کر ترریاب ایک عالیشان محل میں ٹھہرائے گئے جہاں ضرورت اور آسائش کی تمام چیزیں پہلے سے مہیا کر دی گئی تھیں۔ عبدالرحمن نے تین روزہ اُنھیں آرام کرنے دیا تاکہ سفر کا تکان دور ہو جائے۔ اس کے بعد چوتھے روز اپنے محل میں بلایا۔ بادشاہ نے سب سے پہلے ترریاب کو شاہی خلعت سے سرفراز کیا پھر بتایا کہ یہاں آپ کو ماہانہ دو سو اشرفیان ملا کرین گی۔ اس کے علاوہ سال میں چار انعام ملین گے۔ دونوں عید وون کے موقعوں پر ایک ایک ہزار اشرفیان دی جائیں گی اور موسم بہار کے آغاز پر پانچ سو اور نور و نور میں پانچ سو اشرفیان سالانہ دو سو من جو ایک سو من کی ہون بھی بادشاہ کی طرف سے

دیے جائیں گے۔ کئی عالیشان محل اور فرحت بخش باغ بھی زریاب کو دیے گئے۔

بادشاہ عبدالرحمن کو جب اس کا اطمینان ہو گیا کہ زریاب خوش ہیں اور اپنے بود و باش کی طرف سے بے فکر ہیں تو ایک روز انھیں شاہی محل میں بلا کر گانا سنا۔ اس محفل طرب میں زریاب کی عادی بھری آواز نے بادشاہ کو سحر و انداز خود رفتہ کر دیا۔ اُس کے دل و دماغ پر ایسا اثر پڑا کہ اس کے بعد اُسے کسی کا گانا پسند نہ آتا۔ اسی دن سے عبدالرحمن کو زریاب کے ساتھ بچہ اُنس ہو گیا۔ زریاب فقط معنی ہی نہ تھے بلکہ جملہ علوم میں اچھی قابلیت رکھتے تھے۔ زندہ دلی اور ذہانت و طباعی اور فراست و دانائی میں اُن کا ثانی نہ تھا۔ مذاق ایسا پاکیزہ اور سنجیدہ پایا تھا کہ تھوڑے ہی زمانے میں تمام شائستہ صحیفین اُن کی ولہاء ہو گئیں۔ علم ادب لطیف معاشرت ادب مجلس جاود بیا بی اور شاہی خدمات کی انجام دہی میں وہ استاد مانے جاتے تھے۔ علم ہیئت اور جغرافیہ کی اُنھوں نے باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی۔ قلمون کی تقسیم ممالک کے اختلافات ہر ہر جگہ کی آب و ہوا اور دریاؤں کے حالات اور مختلف ممالک کے باشندوں کی خصوصیتیں سب انھیں بخوبی معلوم تھیں۔ شاہ عبدالرحمن ان کی بڑی قدر کرنے لگا۔ تاریخ و سیر شعرو سخن اور دیگر علوم و فنون کے متعلق ان سے بے تکلفی کے ساتھ باتیں کرتا۔ زریاب کو وہ اکثر اپنے ساتھ دسترخوان پر بٹھائے کھانا کھاتا اور کبھی اپنے بیٹوں کے ساتھ کھانے کی اجازت دیتا۔ آخر میں بادشاہ کو زریاب کے ساتھ اتنی خصوصیت ہو گئی کہ شاہی محل کا ایک دروازہ زریاب کے لیے مخصوص کر دیا گیا اور بادشاہ جب چاہتا اسی راستے زریاب کو فوراً اپنے پاس بلا لیتا۔

موسیقی میں زریاب کے کمال کی یہ حالت تھی کہ جو کوئی اُن کا نغمہ دلکش ایک دفعہ سن لیتا زندگی بھر کے لیے اس کی تمنا رہ جاتی۔

دس ہزار فغون کی دھنیں اور اُن سب کے اشعار اُنھیں نہ بانی یاد تھے۔ وہ شاعر بھی تھے۔ مگر جس چیز نے اُن کے وسیع علم میں جان ڈال دی تھی وہ اُن کی فراست اور مذاق سلیم تھا جس صحبت میں وہ آ جاتے اس کا رنگ و فضا بدل جاتا۔ بذلہ بنی اور مذاق کی باتوں میں کوئی ان کی برابری نہ کر سکتا۔ کسی نگرہی صحبت میں کسی شخص کی گفتگو ان سے زیادہ دلچسپ اور معنی خیز ہوتی۔ محسن و جمال کی قدح طاقی میں کوئی ان سے زیادہ صحیح راہ نہ قائم کر سکتا۔ لباس کے معاملے میں اُن سے زیادہ خوش وضع اور کوئی نہ نظر آتا۔ کوئی شخص دعوت یا تقریب کے انتظامات کو ان سے زیادہ کامیابی اور سلیقہ کے ساتھ نہ انجام دے سکتا۔ اندلس کی معاشرت میں زریاب نے بڑا اثر ڈالا۔ اُنھوں نے وہاں بہت سی نئی نئی باتیں پیدا کر دیں جن کا اس سے پہلے لوگوں کو خیال بھی نہ تھا اس معاملے میں اندلس کے باشندے یہاں تک کہ بادشاہ ارکان سلطنت اور امرا بھی زریاب کو اپنا رہبر سمجھنے لگے۔ اور ذوق و شوق کے ساتھ اُن کی تقلید کرتے۔

زریاب کے اندلس میں آنے سے پہلے لوگ لمبے بال رکھتے تھے اور ریش سر میں مانگ نکالا کرتے۔ امر کے یہاں سونے کے برتنوں میں کھانا کھا یا جاتا تھا۔ اب لوگوں نے زریاب کی تقلید میں چھوٹے چھوٹے بال رکھنے شروع کیے اور ٹیڑھی مانگ نکالی اور یہ وضع اندلس ہی سے سارے یورپ میں پھیلی۔ چاندی سونے کے برتنوں کے بجائے زریاب نے شیشے کے برتنوں میں کھانا پینا شروع کیا جو اُن سے زیادہ خوش نامہ تکلف اور اس کے ساتھ ہی پاک و صاف رہتے اس سے پہلے لوگ لکڑی کی سادی میز یا چوکی پر کھانا رکھ کر کھاتے تھے زریاب نے میز کے اوپر ایک چمڑے کا دسترخوان بچھایا جو آسانی سے صاف کیا جاسکتا ہے اور میز بھی میلی نہ ہوتی۔ یہ سب چیزیں اندلس سے رائج ہو کر سارے یورپ میں پھیل گئیں۔

تہ ریاب نے اندلس والوں کو یہ بھی بتایا کہ موسمی تغیرات کے ساتھ اپنے لباس بدل ڈالا کریں۔ اس سے پہلے لوگ صرف تین مہینے گرمیوں کے سادے کپڑے پہنتے تھے اور باقی نو مہینے جاڑوں کے کپڑے پہنے رہتے۔ تہ ریاب نے بتایا کہ جاڑوں اور گرمیوں کے درمیان میں جو فصل ہوتی ہے اُس میں ہلکے رنگ کے خنز، ململ، اور ریشمی کپڑے پہننے چاہئیں تاکہ مسلسل نو مہینے تک ایک ہی قسم کے کپڑے پہننے پہننے طبیعت نہ گھبرا جائے۔

اس سے پہلے بادشاہ اور امرا خوشبو کے لیے گلاب اور دیگر اقسام کے پھول پسوا کے اپنے کپڑوں پر چھڑک لیتے تھے۔ اس میں ہزارہ احتیاط کی جاتی مگر پھر بھی کپڑوں میں دھبے پڑ جاتے اور کپڑے میلے ہو جاتے۔ تہ ریاب نے اپنی ذہانت سے خوشبو پھولوں کا عرق نکال کے اس کا ایک سفوف تیار کر لیا۔ اس کے لگانے سے کپڑے ویسے ہی پاک و صاف رہتے اور خوشبو بھی پیدا ہو جاتی۔ یہ ترکیب سب کو بہت پسند آئی اور اب تک یورپ میں پھولوں کے عرق یا سفوف کا رواج چلا آتا ہے۔

تہ ریاب نے اہل اندلس کو بہت سی ترکاریاں بھی بتائیں جو وہاں بہ کثرت پیدا ہوتی تھیں مگر کوئی اُن کا استعمال نہ جانتا تھا کئی قسم کے کھانے بھی تہ ریاب کی طرف منسوب ہیں اور اب تک یورپ میں بڑی بڑی کھف قیمتیں سمجھی جاتی ہیں۔ غرض تہ ریاب نے اندلس والوں ہی کو نہیں بلکہ پورے یورپ کو بود و باش کھانے پینے اور سٹنے جلنے کی بہت سی جزئی باتیں بتائیں۔ اور اُن میں رائج کر دیں اور وہ اس قدر دل آویز تھیں کہ سب اُنھیں پسند کرتے اور فوراً اختیار کر لیتے۔ اسپین میں جب تک مسلمانوں کی حکومت رہی تہ ریاب کا نام بھی مشہور ماہرین فن۔ شاعر و نثر نویس سالار و نادر و وزیر و نادر اور کامیاب حکمرانوں کے ساتھ لیا جاتا رہا۔

زریاب کو عبدالرحمن کے دربار میں اس قدر رسوخ حاصل ہو گیا تھا اور عبدالرحمن اُن پر اتنا مہربان تھا کہ لوگ اپنی عرضیاں لے کر اُن کے پاس آتے کہ وہ اپنی سفارش کے ساتھ بادشاہ تک پہنچا دیں۔ زریاب حتیٰ الامکان لوگوں کے کام کال دیا کرتے۔ مگر انھوں نے کبھی امور سلطنت میں دخل نہیں دیا۔ وہ جانتے تھے کہ ان معاملات میں پڑنے سے سازش کا دروازہ کھل جائے گا۔ اور اس سے بڑی خرابیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ زریاب کی وجہ سے اندلس میں لوگوں کو موسیقی کا شوق پیدا ہوا اور یہ عام طوم پر سارے یورپ میں مشہور تھا کہ اہل اندلس خوش پوش پاک و صاف رہنے والے اور سب سے زیادہ کھیل اور گانے بجانے کے مشتاق ہیں۔ اندلس میں جب کوئی شخص کسی استاد کے پاس گانا سیکھنے جاتا تو استاد اُس سے کوئی شعر پڑھواتا خواہ وہ کسی دھن میں ادا کرے۔ اس کے بعد اُسے آواز میں لوچ پیدا کرنا بتایا جاتا۔ یہ طریقہ موسیقی کے استادوں نے زریاب ہی سے لیا تھا کیونکہ انھیں نے سب سے پہلے اسے رائج کیا۔ زریاب کا یہ قاعدہ تھا کہ جو کوئی اُن سے گانا سیکھنے آتا اُسے ایک قالم پر بیٹھا دیتے اور بلند آواز میں اُس سے چند شعر پڑھواتے۔ جب اس بات کا اطمینان ہو جاتا کہ آواز کافی بلند ہے تو گانے کے اصول اسے بتاتے۔ لیکن اُس شخص کی آواز اگر کمزور ہوتی تو اُس سے کہتے کہ اپنا حامہ سر سے اتار کے پیٹ کے گرد کس کے پیٹ کا اس سے اُس کی آواز اونچی ہو جاتی اور سانس بھی نہ پھولتی۔ اگر کسی شخص کا مونہ لورا نہ کھلتا تو اس سے کہتے کہ تین انگلی جوڑا لکڑی کا ایک ٹکڑا مونہ میں رکھ کے سو رہو۔ اس ترکیب سے اُس کا مونہ کھلنے لگتا۔ ان ابتدائی امتحانوں کے بعد اگر وہ دیکھتے کہ یہ شخص موسیقی کی تعلیم کے قابل تو اُسے اس کے اصول بتانا شروع کرتے اور اُس سے شق کرانے۔ ورنہ اسے صاف جواب دیتے کہ آپ موسیقی کے پھر میں نہ پڑیے۔ کسی اور جانب تو ہم دیکھے۔

زریاب کے آٹھ بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ اُن کے بیٹوں میں عبدالرحمن عبید اللہ اور قاسم نے موسیقی میں بڑی مہارت حاصل کی۔ زریاب

کی بیٹی تھو نہ وزیر ہشام بن عبدالعزیز کو بیاہی گئی۔ اور اُس نے بہت بڑی عمر پائی۔ عالم لوگوں اور محتاجوں کی وہ بہت مدد کرتی تھی۔ جب اس کا انتقال ہوا تو لوگوں کو بہت صدمہ ہوا۔

قدیم تمدن ایران

(از جناب لطافت حسین صاحب)

ایران کی طبیعی خصوصیات

حدود سرزمین ایران براعظم ایشیا کا وہ خطہ مرتفع ہے جس کے شمال میں کوہ البرز۔ جنوب میں بحر ہند۔ مشرق میں کوہ ہندوکش اور آندس کی وادیاں ہیں۔ مغرب میں دجلہ۔ خلیج فارس پشت کوہ اور آرادت کی پہاڑیاں ہیں۔ ان حدود میں بہت کچھ حصہ افغانستان اور ترکوچستان کا بھی آگیا ہے۔

صوبہ جات مشہور قدیم صوبوں میں عراق عجم۔ آذربائیجان۔ طہران۔ (قدیم سلطنت میدہ)۔ فارس (قدیم سلطنت فارس)۔ خراسان و خوزستان و آذربائیجان (قدیم سلطنت آرم) اور کرمان (قدیم کرٹینیا) ہیں۔ گیلان و مازندران جو بحر ہند کے قریب واقع ہیں ایران کی قدرتی سرحد کے باہر ہیں مگر پولیٹیکل حیثیت سے ہمیشہ اسی میں شامل سمجھے گئے ہیں۔

پہاڑیاں یہ ملک نہ صرف چاروں طرف پہاڑی سلسلوں سے گھرا ہوا ہے بلکہ جگہ جگہ آندرونی حصے میں بھی وہ متوازی یعنی ایک دوسرے کے آگے پیچھے چلے گئے ہیں اور ان کی بعض وادیاں پس پس کی چوڑی ہیں۔ شمالی سلسلے میں سب سے بڑے پہاڑ ہندوکش اور البرز ہیں جنوبی سلسلے کی مشہور چوٹیاں

۱) اس کے تین حصے تھے (۱) میدہ میگنا یعنی عراق عجم (۲) میدہ اتر و پے تھی یعنی آذربائیجان (۳) میدہ ریغانہ یعنی نزد طہران۔ عہ فارس یا پارسا ماہ قدیم دریا۔ لہذا قدیم ہر گزنی۔ بحر کیس پی بن یا بحر گیلان۔

کوہ ہزار اور کوہ لالہ زار اور ہمدان کے قریب کوہ آلو بند ہیں۔
ریگستان | اس سرزمین کے وسط میں ایک عظیم الشان ریگستان ہے جسے
 اس کا قلب مردہ کہنا چاہیے۔ اسے تو طائفے ہیں یہاں نہ بدست آمدنیان
 چلتی ہیں اور گرمی اور سردی دونوں شدت سے ہوتی ہیں۔ اس کے کناروں
 پر بعض مشہور شہر آباد ہیں مثلاً طہران اور شہد شمال میں۔ تیزد اور کرمان جنوب
 میں۔

سمندر | جنوب اور جنوب و مغرب میں خلیج فارس ہے جہاں سے دنیا میں
 جہاز رانی کی ابتدا ہوئی۔ اور سب سے قدیم تمدن اسی کے ساحل پر قائم ہوا۔
 شمال میں بحر خزر ہے۔ سکندر کے زمانے میں اس سمندر کی سطح موجودہ سطح
 سے ڈیڑھ سو فٹ زیادہ اونچی تھی۔

جھیل | ملک میں متعدد جھیلیں ہیں جن میں سب سے بڑی آرمیا ہے جس کا
 پانی کھاری ہے جھیل وان اور گونج بھی مشہور ہیں۔

دریا | اس ملک میں دریا بہت کم ہیں۔ اور کوئی بہت بڑا نہیں۔ تمام
 ایران میں سوا قارون کے اور کوئی دریا جہاز رانی کے قابل نہیں۔
 زندہ رود قارون کے قریب سے نکلتا ہوا دروہہ اصفہان کو میل کر تا ہوا ایک دلدل میں
 غائب ہو جاتا ہے شمال میں کوہ آرات کے قریب دریائے آرس نکلتا ہے مشرق میں کرل عزم ایران
 کا سب سے زیادہ لمبا دریا ہے جو بحر خزر میں گرتا ہے مشرق میں ایک دریا تاجن بھی ہے۔
 ان کے علاوہ اور بہت سی چھوٹی چھوٹی ندیاں ہیں جو تھوڑی دور
 چلنے کے بعد ریگستان میں پہنچ کر سوکھ جاتی ہیں۔ اور سوا موسم بہار کے
 پھر کسی نہ مانے میں نہیں نظر آتی ہیں۔ مختلف مقامات میں نالے بھی کھدے ہیں۔
 گر ان کا پانی کھاری ہوتا ہے۔ دریا سے عمان ایران سے دور ہے مگر
 کسی زمانے میں وہی دریا ایران کی مشرقی سرحد مانا جاتا تھا۔ یہ پائیس

عہ قدیم ایران میں۔ عہ اخیرین آندھیوں کے سبب سے شاید ایران میں زمانہ
 قدیم سے ہوا کی چکیوں کا رواج چلا آتا ہے۔

بکل کے بحر ازل میں گرتا ہے سکندر کے زمانے تک وہ بحرِ خضر میں گرتا تھا۔
زمرہ خیزی | گیلان اور ناندراں نہایت سرسبز اور شاداب ہیں
 آذربائیجان بھی کسی قدر غنیمت ہے۔ عربستان میں بھی چلیج فارس کے
 قریب بکثرت نخلستان (جھوڑوں کے جھنڈ) موجود ہیں۔ مگر عراق عجم
 خوزستان اور فارس میں بہ استثنائے چند دادیوں کے زراعت
 بہت کم ہوتی ہے۔ مشرقی حصہ جس میں خراسان بھی شامل ہے اکثر بجز
 ریگستان اور بیابانوں میں کہیں سبزے کا پتہ نہیں۔ اکثر محققین کا خیال
 ہے کہ یہ تمام مرفع خطہ ایران زرد برونز یا دھخاک ہوتا جاتا
 ہے۔ اور جسے دور یا سوکھ رہے ہیں یا غائب ہوتے جاتے ہیں۔
آب و ہوا | اس ملک کی آب و ہوا میں بھی عدد درجہ اختلاف ہے۔
 ہاڑیان بہت سرد ہیں۔ کوہ البرز کی چوٹی دماوند چوبیس ہزار فٹ اونچی
 ہے۔ اکثر برف سے ڈھکی رہتی ہے۔ یہ خلافت اسکے دوسرے حصے بہت گرم و خشک
 ہیں۔ ناندراں اور گیلان کی آب و ہوا مرطوب ہے۔ گرمی کے موسم میں راتیں ٹھوکی
 خشک ہوتی ہیں۔ سردی کا زمانہ نہایت خوشگوار اور صحت بخش ہے۔

آبادی | اس ملک کی آبادی زمانہ قدیم میں ڈیڑھ کروڑ سے زیادہ
 تھی۔ مگر آج کل صرف ایک کروڑ رہ گئی ہے۔ اس میں گیارہ ہزار مجوسی ہیں
 نو لاکھ سُنی اور باقی سب شیعہ ہیں۔

شاہ راہین | سب سے قدیم وہ شاہ راہ ہے جو بابل سے شروع
 ہو کر پشت کوہ کی دادیوں میں سے ہوتی ہوئی کرمان شاہ اور ہمدان
 تک جاتی ہے دوسری ہتھ منشلی زمانے کی یادگار سار ولس سے ہمدان
 تک اور وہاں سے ترے اور باختر تک جاتی ہے۔ مغربی دنیا اور ایشیا
 کی یہی سب سے بڑی شاہ راہ تھی اور اسی پر سکندر نے دارا کا تعاقب
 کیا تھا۔ ایران میں عمدہ ٹرکین بہت کم ہیں سب سے زیادہ آسان
 شمال مغربی راستہ جو جہان ترابزند اور طغلس سے مختلف ٹرکین تبریز میں آکر مل جاتی ہیں۔
نباتات | سوا ناندراں اور گیلان کے جہان ترے بڑے بڑے گھنے

جنگل اور چراگاہیں ہیں اور خلیج فارس کے ساحل کے قریب جہاں کثرت سے نخلستان ہیں باقی ہر جگہ نباتات اور پیداوار کی قلت ہے۔ ہاڑبان بے گیارہ خشک ہیں۔ فقط ان مقامات پر کچھ سبزہ نظر آتا ہے جہاں دریا ہیں۔ درختوں میں بید۔ بید مجنون۔ چنار۔ آجروٹ۔ شاہ بلوط وغیرہ ہیں۔ صنوبر اور سرو بہت کم ہیں۔ پھولوں میں لالہ۔ چمپلی۔ گلاب۔ اور گلی محمود میں پھولوں میں سیب۔ نارنگی۔ آڑو۔ آبپاتی۔ سفرجل۔ جیر۔ آلو بخارا۔ انگور۔ بکھور۔ شہتوت۔ آنجیر۔ انار۔ کستہ۔ بادام۔ خمر لوزے۔ وغیرہ ہیں۔ دنیا میں سب سے پہلی انگور کی کاشت آذربائیجان میں ہوئی اور کستہ۔ بادام مختلف پھول پھل اور لوسرن وغیرہ ایران ہی سے یورپ۔ چین اور ہندوستان میں گئے۔ ترکاریوں میں گوہ بھی سیکن۔ گڑی۔ توتلی۔ آپالک وغیرہ بہت عام ہیں۔ انار۔ مین گتھون۔ چاول۔ باجرا۔ جوار۔ اور تیر ہیں۔ اور دیگر اشیاء پیداوار میں تمباکو۔ آفیون۔ کپاس اور مہنگا بولی جاتی ہیں۔

حیوانات شیراب تقریباً مفقود ہے۔ نہ کچھ بھی بہت کم ہیں۔ جیتے بھر خضر کے قریب نظر آتے ہیں۔ بھیر یا تیندوا۔ لکڑ بھگا۔ ٹوٹری۔ سیار جنگلی سونو بھیر۔ بکری۔ اور اونٹ بہ کثرت ہیں۔ میدانوں میں غزال جھیلوں کے قریب گورخر۔ ہاڑون پر جنگلی بھیر ہیں اور ہرن۔ آذربائیجان میں بارہ سنگھے اور عربستان اور بحرہض کے اطراف میں بھینسے موجود ہیں۔ میدیہ کے گھوڑے جھینسے بنائی گھوڑے کہتے تھے زمانہ قدیم میں ساری دنیا میں مشہور تھے یہ گھوڑے سمند الٹی یا بھورے رنگ کے آتھے اور تیز رفتاری و جفاکشی میں اپنا نانی بنیں رکھتے تھے۔ سفید گھوڑے بہتر کہ سمجھے جاتے تھے۔ بادشاہ ان کی قربانی کرتے اور آجکل بھی ان کی بڑی قدر کی جاتی ہے۔ پرندوں میں باز۔ شاہین۔ گدھ۔ چیل۔ کوس۔ بمل۔ دراج۔ تیر۔ بھٹ تیر مرغابی راج ہنس۔ اور ماہی خور وغیرہ ہیں۔

معدنیات قدیم زمانے میں ایران معدنیات کے لیے مشہور تھا۔ اہم ہی میں سب سے پہلے تانبے کی کان دستیاب ہوئی تھی کوہ دماوند

سے تاجور و نکلتا تھا۔ اور زہر مرد۔ کچھ آج۔ نیلم۔ عقیق۔ ستونے۔ چاندی۔
 تو ہے اور پیسے وغیرہ کی کابین بھی بکثرت انھیں۔ اور اب بھی موجود
 ہوں گی۔ مگر لوگ اُن کی طرف سے غافل ہیں۔ اب سوائے ٹھوڑے سے
 کوئلے اور۔ تانبے۔ گندھک۔ گیرد۔ اور مٹی کے تیل کے اور کسی چیز سے
 فائدہ نہیں حاصل کیا جاتا۔

الفتاب

یہ نظم ہمارے عنایت فرامو لوی غلام طیب صاحب
 بی اے بی ٹی مگار عثمانیہ کالج اور گھا آباد دکن
 نے ہمیں دگداز کے لیے عنایت فرمائی ہے۔ ہم اسے
 شکریہ کے ساتھ درج کر کے ہدیہ ناظرین کرتے ہیں
 ہمارے ناظرین اس کا اندازہ خود ہی فرالین کر چھٹی
 جذبات کو کس موثر پیرائے میں ادا کیا گیا ہے۔

محمد صدیق حسن

ایڈیٹر

نوٹ

ایک شاعر اپنی مجموعہ کو سپردِ خاک کر کے اپنے خیالات سے
 ہمکلام ہے۔

اے مری جان مری ساری دنیا	اے مری دل کی پیاری دنیا
خواب راحت سے ذرا ہو بیدار	تیرے بالین پہ کھڑا ہے تیرا یار
کیسے بچا یا تجھے یہ فرض زمین	تو بکھی تھی دل عاشق کی گمین
نازدانہ از تجھے بھول گئے	بستر نرم گسا بھول گئے
آج تنہائی ہے اور گوشہ تنگ	اور خاموشی دل ہم آہنگ
ہے غضب کچھ نہیں ملتا جواب	یہ تغیر یہ خاموشی یہ حجاب

خیر جیسا تا ہوں نہ آؤں گا کبھی
 خواب میں تم ہو تو بیدار ہوں میں
 تم کو اللہ نے ہمت دے دی
 راحت روح تمہیں درد نہ تھے
 ہاں گریہ تو میں پوچھوں گا ضرور
 ساتھ کس کا ہے کہاں رہتے ہو
 کیا تمہیں دھیان مرا ہے کہ نہیں
 کیا خیال غم دنیا بھی ہے
 کبھی آتا ہے تمہیں گھر کا خیال
 تم تو خاموش ہو یہ بات ہے کیا
 مست رہتے ہیں جہاں پیرو جوان
 ان کی فطرت بھی بدل جاتی ہے
 توڑ دیتے ہیں وہ رشتے سارے
 جکڑے رہتے ہیں وہ زنجیروں میں
 اب بھی تم چپ ہو یہ حالت کیا ہے
 آج تک ایسی طبیعت تو نہ تھی
 دل تمہارا کبھی یوں سرو نہ تھا
 دوسرا نام ہے بد خوئی کا
 یا کہ سیرت کا بدل جانا ہے
 یا ستم کش ہو کہ مجبور رہی ہے
 کیا تمہیں یاد نہیں کل کی ہے بات
 چیخ کر تم مجھے بلواتے تھے
 دور جانے نہ کبھی دیتے تھے
 میرے جانے سے ستم ٹوٹا تھا
 چار دن کے لیے باہر جانا

تم کو اگر نہ ستاؤں گا کبھی
 تم تو نفاصل ہو یہ ہشیار ہوں میں
 اور مجھے رنج کی لذت دیدی
 تم کو غفلت نفس سرد تھے
 مجھ سے رہتے ہو بھلا کتنی دور
 کس کے پردے میں نہاں رہتے ہو
 دل محبت سے بھرا ہے کہ نہیں
 مجھ سے ملنے کی تمنا بھی ہے
 کیا تمہیں ہے دل مضطرب کا خیال
 موت بھی کوئی خراب بات ہو کیا
 اور سنتے نہیں غیہ و ن کی خان
 اور طبیعت بھی بدل جاتی ہے
 مر کے بنتے ہیں فرشتے سارے
 محو رہتے ہیں کہ تصویر دن میں
 سچ بتاؤ یہ نصیبت کیا ہے
 تم میں چپ رہنے کی عادت تو نہ تھی
 سنگ خارہ نہ تھا بے درد نہ تھا
 موت حیلہ ہے ستم جوئی کا
 اپنے آپ سے نکل جانا ہے
 بے تعلق ہو کہ مجبور رہی ہے
 بے ہمتی تم کو نہ ملتی تھی نجات
 میرے چپ رہنے پہ جھنجھلائے تھے
 وعدے سو سو طرح کے لے لیتے تھے
 میں نہ آتا تھا تو دم ٹوٹا تھا
 تم پہ ہوتا تھا قیامت لانا

آج اس درجہ تکلف ہے تمہیں
 کیا تمہیں بھول گئیں وہ باتیں
 دل سے بجلی کا وہ آنا جانا
 روان روان تھا زبان دل و دفتر
 بدلیاں اور وہ ساون کا سماں
 وہ ہواؤں سے نطشہ کا اڑنا
 بے پیہ وہ سنے صافی کی ترنگ
 ہاے وہ گوش و نظیر کی جنت
 وہ مرے قلب و جگر کی جنت
 آج خاموش پڑی ہے تہ خاک

نہ وہ سودا نہ وہ قلب بیباک

موت اور زیت کا کیا ساتھ بھلا
 چاہے بولو کہ نہ بولو ہم سے
 موت کے پھیر میں مت آ جانا
 تم رہو دور کہ نزدیک رہو
 پر نہ تکلیف سے غافل رہنا
 روح کو دور و مجسم کرنا
 ہم سے چھٹنے کا نہ ااتم کرنا

اطلاع

جملہ خریداران دگلڈاز کی خدمت میں التماس ہے کہ خط و کتابت میں اپنا
 نمبر خریداری لازمی طور پر بتاویا کریں جو ان کے پتہ کے ساتھ لکھا ہوتا ہے جس پر
 نمبر ۱۳۱ ڈاکخانہ کا نمبر اس کے حوالہ کی ضرورت نہیں۔ اگر نمبر کا حوالہ نہ
 ہو گا تو ممکن ہے جواب میں تاخیر ہو یا جواب ہی نہ دیا جاسکے۔
 بیچر دگلڈاز



شاعر کو معشوق چاہیے۔ اور شراب اور غوانی۔ بس یہی دو چیزیں اس کی دنیا ہیں۔ اور اُنھیں دو پہ اُس کی زندگی ہے۔ ہمارے فارسی اور اردو شاعروں کا معشوق ایک خوبصورت لڑکا ہے جسے نہ اُنھوں نے کبھی دیکھا ہے۔ اور نہ اُسے پہچانتے ہیں۔ اپنے دل کی لوح پر وہ مصور کی طرح اُس کی ایک خیالی تصویر کھینچتے ہیں۔ اور اس پر عاشق ہو جاتے ہیں۔ یہ معشوق اگرچہ ہمیشہ اُن کے دل میں رہتا ہے اور ہر وقت اُن کے پاس موجود ہوا کرتا ہے مگر اُنھیں فراق کی شکایت ہے۔ اسی غم میں روتے پیتے ہیں۔ آہ و زاری کرتے ہیں اور ایک ایک کے آگے دکھار دتے پھرتے ہیں۔

اسی آتش فراق کی گرمی سے بیاب ہو کر جب وہ اس کی تلاش میں نکلتے ہیں تو وہ اُنھیں کسی بت خانے میں مل جاتا ہے۔ اور اس کا ذوق و شوق بیاب کرتا ہے تو بت پرستان کے کعبے کی طرف سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ اور تباہ گئے میں ڈال کے برہن بن جاتے ہیں۔ اسی طرح جب سنے اور غوانی کی جستجو میں سرگردان ہوتے اور دل کی لگی بجھانے کو نکلتے ہیں تو وہ اُنھیں آتش پرستوں کے بوڑھے مقتدا (پیرمغان) کے پاس ملتی ہے۔ اور اُس آب آتشین کا شوق اُنھیں آتش پرست بنا دیتا ہے۔

دنیا کے صاحب فہم لوگ اس بات کو کس قدر حیرت اور تعجب سے دیکھتے ہوں گے کہ ایک شاعر جو اپنے آپ کو مسلمان بتاتا ہے۔ توحید کا قائل ہے۔ شرک کو کفر جانتا ہے وہی شعر کہنے وقت بکارت پرست بنجاتا ہے۔ اپنی زبان سے اپنے کافر ہونے کا اقرار کرتا ہے اور آواز بلند کرتا ہے ع "کافر عشق مسلمان مراد رکھنیست" اسی طرح شراب کو وہ حرام و نجس جانتا ہے۔ اور اس کی مضر تون سے بخوبی واقف ہے۔ مگر شاعری کی دنیا میں آیا اور صدا لگائی کہ عہدہ ساقی آب آفتاب اور اس کے بعد دعوے کے ساتھ کہتا ہے۔

من از شراب میخورم ببا ننگ کوں میخورم پیالہ ہائے وہ منی علی الروس میخورم
شراب گبر می چشم سے مجھوس میخورم

اور اس سے بھی زیادہ حیرت کی یہ بات ہے کہ کوئی ہندو جب فارسی کا شاعر بنتا ہے تو کافر بننے کے شوق میں مسلمان بنتا ہے اور مسلمان ہونے کے بعد کفر کا دعویٰ کر کے بتوں کو پوجتا اور شراب اور غوانی کے جام لٹکا دیتا ہے۔

اسی پر منحصر نہیں۔ ہمارا مسلمان شاعر مذہباً اگر جہت پرست بن گیا ہے اور علانیہ طور پر بتوں کے آگے سجدہ کرنے کا اعتراف کرتا ہے۔ مگر تعجب کی یہ بات ہے کہ جس طرح ہم اسے کعبے سے منہ پھیر کے تھانے کی طرف جانے دیکھتے ہیں اسی طرح یہ بھی دیکھتے ہیں کہ کبھی وہ کنشت (آتشکد) کی طرف نکل گیا۔ اور کبھی دیر (گرجے) میں گھس گیا اس کے کنشت میں جانے کی تو خیر یہ تاویل ہو سکتی ہے کہ شراب خانہ خراب کے شوق میں جو اداوت و عقیدت اُسے پیر معان کے ساتھ ہو گئی ہے وہی شاید اُسے آتش پرستوں کے بعد میں کھینچ لے گئی ہوگی۔ مگر یہ کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ دیر میں کیوں گیا؟ وہاں کیا رکھا ہے اور کس چیز کا شوق بعد نصاریٰ میں کھینچ لے گیا؟ نہیں معلوم یہ اُس کا اضطراری و اتفاقی فعل ہے۔ یا محض ایک حرکت اضطراری ہے۔

ممکن ہے کہ شراب کے نشے میں بہک کے بھوض تھانے کے گرجے میں جا پڑا ہو۔ یہ بھی خیال ہو سکتا ہے کہ وہ ہندوستان کے موجودہ گرجے میں نہ گیا ہو گا جو زیادہ تر پیر و سٹنٹ سیچون کے ہیں بلکہ وہ پرانے کیتھولک عیسائیوں کے کسی کینسے میں جس صد ہا تصویریں اور سورتیں موجود ہوتی ہیں تھانے کے دھوکے میں چلا گیا ہو گا۔

لیکن یہ تو جہین شاعرانہ خیال آفرینان ہیں۔ صلیت کچھ اور ہی ہے جس کا حال مسلمان شعرا کی تاریخ پر غور کرنے سے شاید معلوم ہو سکے اور ہم سمجھتے ہیں کہ معشوقوں کی تاریخ دلچسپی سے بھی خالی نہ ہوگی۔

عرب میں شاعری اسلام سے پہلے تھی۔ اور وہ ایسی شاعری تھی جس کے فطری جذبات کا پتہ بعد والے ترقی یافتہ شعراے عرب کے کلام میں نہیں ملتا۔ پرانے شعراے عرب کی عام معشوقہ ان کی بہت عم (جھجکی بیٹی) ہوا کرتی تھی۔ جو اکثر ان کی منکو صہ بی بی ہو جاتی۔ اُس کا نام وہ بے تکلف دہلا۔ مال اپنی نظموں میں لیتے۔ اور اُس کے عشق میں جذبات دی کو ظاہر کرتے۔ اگر اُن کی آرزو کے خلاف اُس کے ساتھ شادی نہ ہوئی اور وہ اُن سے چھوٹ کے اور بچھڑ کے کسی اور وادی یا صحرا میں چلی گئی تو اُس زمانے کو جب اُس سے ملتے جلتے تھے اُن مقاموں کو جہان اس کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے تھے اس کے گھر کو۔ اس کے نیچے کے گرد کے منظر کو اس کے پیلو کے درخت کو۔ اور اس کی ٹہنیوں پر بیٹھ کے گونجنے والے گبو تر و ن کو یاد کر کے روتے۔ اور جب کبھی موقع مل جاتا تو راتوں کو جب سب لوگ سوتے ہوتے اور ہر طرف خاموشی کا عالم طاری ہوتا۔ وہ تارون کی روشنی میں اُس کے قبیلے کی صحرائی فرد گاہ میں دبے پاؤں جاتے۔ چورون کی طرح اس کے نیچے میں گھستے۔ آہستہ سے اُسے جگاتے اور باہر لائے کسی تو وہ ریگ کے گھوٹھ میں باکسی پیلو کے درخت کے نیچے بیٹھ کے اُس سے عشق و محبت کی باتیں کرتے۔ وہ ڈراتی کہ یہاں اپنے دشمنوں میں بے دھڑک کیوں گھس آئے ہو؟ میرے باب

بھائی اور میرے قبیلے والے ذرا بھی سن گئے تو یوٹیان اڑا دیں
 گئے۔ یہ اس کے جواب میں اپنی بہادر ریان ظاہر کرتے۔ اپنی شمشیر زنی و نیزہ
 بازی کے کمالات بیان کرتے۔ پھر صبح سے پہلے ہی اُسے اُس کے پیچھے من
 واپس بھیج کے پٹٹا آتے۔ اور اُس واقعے کو نہایت ہی مزے اور جوش
 کے الفاظ میں موزون کر کے قدر و امان سخن کے سامنے پیش کر دیتے۔
 اگرچہ بادی النظر میں یہ بہت ہی بد اخلاقی کا نمونہ معلوم ہوتا ہے مگر
 پرانے شعرا اور اُن کے حال سے واقفیت رکھنے والے و ثوق کے ساتھ
 کہتے ہیں کہ ان عاشقانہ ملاقاتوں میں بد اخلاقی بدینتی اور بے عصمتی
 کو ذرا بھی دخل نہ ہوتا تھا۔ لیکن معشوقہ کے ساتھ اگر شادی ہو چکی ہوتی
 تو اپنی نظموں میں وہ اس سے جام شراب مانگتے۔ پھر اس کے خن و جمال
 کی تعریف کرتے اور اُس کے بعد اپنے قبیلے کے مفاخر اور اُن کی بہادری
 فیاضی اور عظمت کے کارنامے زور و شور اور جوش و خروش کے ساتھ
 بیان کرنا شروع کر دیتے۔

یہ تھی عرب کی پہلی شاعری۔ جس میں اُن کی معشوقہ ہمیشہ
 ایک خوبصورت عورت ہوتی اور وہ بھی اُن کے چچا کی بیٹی یا قبیلے کی کوئی
 اور لڑکی جو اُن کی منگیتر یا منکوحہ بی بی ہو سکتی یا ہوتی۔ یہی مذاق
 اسلام کے بعد والی پہلی دو صدیوں کے شعرا کا بھی تھا۔ فرق اتنا تھا
 کہ شعرا سے جاہلیت کی معشوقہ میں لازمی طور پر کچھ زیادہ اتیان نہ رکھتی
 تھیں۔ اور اُن کے شوق میں غزل سرائی کرتے وقت وہ اُس کی جس قدر
 تعریف چاہیں کر جائیں۔ مگر اپنی کہنے میں اُس کی بہت کم سنتے تھے اس
 زمانے کی بہت سی عورتیں گو کہ شاعرہ تھیں مگر وہ زیادہ تر اپنے
 عزیز وں یا شوہروں کی موت پر نوحہ خوانی کرتیں۔ اُن کے فضائل
 بیان کرتیں۔ اُن کی شجاعت۔ سخاوت۔ ایثار۔ نفس اور ہمدردی
 کے کارنامے سنانیں۔ اُس کے دشمنوں کی تحقیر کرتیں اور خاموش ہوتی
 مگر معشوقہ کی حیثیت سے عاشقوں کے جذبات پر اپنے خیالات ظاہر

کرنے کا اُن دنوں رواج کم تھا۔

اسلام کے بعد یہ ہو گیا کہ عاشقانہ جذبات ظاہر کرنے والے تمام شاعروں کی معشوقائیں اُن کے عشق کی قدر کرتی تھیں اور اُن کے بیانیہ جوش و خروش کا جواب اپنے سوز و گداز میں دے ہوئے شعر و سخن میں دیتیں۔ اس عہد کے اکثر شاعروں کی معشوقائیں بھی انھیں کی طرح مشہور تھیں۔ اور اُن کے دیوان صرف اُن کے نہیں بلکہ اُن کے اور اُن کی محبوبہ کے کلام کے مجموعے ہیں۔ جمیل شاعر کی معشوقہ جتنی تھی۔ کثیر کی معشوقہ غزلی تھی۔ قیس بن ذریعہ کی معشوقہ کتنی تھی۔ مجنون عامری کی معشوقہ لیلیٰ تھی۔ عروہ بن خزام کی معشوقہ عفرا تھی۔ عبد اللہ بن عجلان کی معشوقہ ہند تھی۔ ذوالرمہ کی معشوقہ مہ تھی۔ مالک کی معشوقہ جنوب تھی۔ عبد اللہ بن علقمہ کی معشوقہ حبیبہ تھی۔ نصیب کی معشوقہ زینب تھی۔ مرقس کی معشوقہ آسماء تھی۔ عقبہ بن حباب کی معشوقہ زینب تھی۔ کعب کی معشوقہ مہلا تھی۔ اور اسی طرح کے اور بہت سے عاشق و معشوق تھے جن کے حالات عربی تاریخ و ادب کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ ان دنوں شعر و سخن کا ذوق عربوں کی سوسائٹی میں اس قدر بڑھ گیا تھا کہ بعض شریف زادیان خود ہی چاہتیں کہ اُن پر کوئی شاعر عاشق ہو کر ان کی تعریف میں غزل سرائی شروع کر دے۔ اسے اعزہ گو اس کو گوارا نہ کر سکتے۔ گروہ بھی محض کسی شاعر کی تشبیہ کی وجہ سے پاکدامن خاتون کی عصمت پر شبہ نہ کرتے۔ اس لیے کہ شاعروں کے عشق کے لیے بالاتفاق پاکبازی و عصمت لازمی تھی۔ اور شعرا کی تشبیہ سے کسی شریف زادی کے ناموس پر حرج نہ آتا۔ یہ بات جاہلیت میں بھی موجود تھی۔ آخر زمانہ جاہلیت کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ مستند شاعر اعشیٰ تھا۔ جس نے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کی نعمت میں چند شعر بھی کہے تھے۔ تمام شرارے عرب اُسے سب سے بڑا شاعر مانتے تھے۔ اور عرب میں گھر گھر مشہور تھا کہ وہ جس کی تعریف کرتا ہے وہ چمک جاتا ہے۔ اور جس کی مذمت کرتا ہے وہ مٹ جاتا ہے۔ اس کے پاس ایک عورت آئی اور کہنے لگی سیری تین بیٹیاں ہیں اور تینوں کنواری بیٹھیں ہیں۔

آپ اُن میں سے ایک پر اشعار میں اظہارِ عشق کیجئے تو اس کی شادی ہو جائے۔ اُغشی نے منظور کر لیا۔ اور اُس کے شوق میں چند اشعار کہے ہی تھے کہ اُس کی ماں نے ایک اونٹ ہدیہ بھیجا اور اطلاع دی کہ اس لڑکی کی تو آپ کی عنایت سے شادی ہو گئی۔ اب آپ دوسری پر اظہارِ عشق کریں۔ اُغشی نے دوسری کی تعریف میں بھی شعر کہے اور اُس کی شادی بھی ہو گئی۔ اسی طرح تیسری کی شادی بھی اُغشی کی تئیب سے ہوئی۔

عبد بنی عباس کے اوائل میں امین الرشید کے ایسے بد اخلاق خلیفہ اور ابو نو اسس کے ایسے بے تنگ و بے حمیت شاعر کی پرکاریوں نے پہلے پہل شعرا کے معشوقوں میں امر و حسین لڑکوں کو داخل کرنا شروع کیا ہیں صحیح طور پر نہیں معلوم کہ امر و پرستی کا مرض ایرانوں میں ساسانیوں کے وقت سے چلا آتا تھا یا عربوں کے فتحا ہوئے کے بعد اُن عربوں میں جو صحرائی وطن کو خیر باد کہے خراسان و عجم میں آباد ہو گئے تھے اور اپنی بیویوں سے دور تھے خود بخود پیدا ہو گیا۔ لیکن دوسری صدی ہجری کے وسط ہی سے ہم تعجب کے ساتھ دیکھتے ہیں کہ بعض بعض شعراے عرب کے معشوق بجائے اُن کی بیویوں یا قبیلے کی ناز آفرین لڑکیوں کے نو عمر لڑکے بن گئے۔

ان دنوں شام و روم اور عراق و آرمینیا وغیرہ میں عیسائیوں کے مذہب گرجے تھے اور اُن کے متعلق بڑی بڑی خانقاہیں تھیں۔ ان خانقاہوں میں نفس کش راہبوں کے علاوہ بہت سے نو عمر اور حسین لڑکے تقدس و ربانیت کے مخصوص سادے لباسوں میں رہا کرتے اور روحانی تعلیم پاتے۔ ریاضتیں کرتے، ضربیں لگاتے۔ اور نفس کشی کی کوشش کرتے۔ ان میں سے اکثر حسین و خوب رو ہوتے اور اُن کی خاص وضعوں میں سادگی کے ساتھ کچھ ایسا بائبلین ہوتا کہ عاشق مزاج اُن پر فریفتہ ہو جاتے۔ اور مشہور ہو گیا تھا کہ حسینوں کا مجمع دیکھنا ہو تو گر جون اور خانقاہوں کی سیر کرنا چاہیے۔ ان خانقاہوں کے متعلق پُر قصا باغ ہوتے اور راہب اپنے ہاتھ کی محنت سے اُنھیں نہایت پُر نضا اور سرسبز و شاداب رکھتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی روز میں

شعرا عرب کے معشوق یہ خاتقا ہون کے خوب در لڑکے بن گئے۔ اور
گر جون کی سواد وہ چمن قرار پا گئے جس میں عربی باغ سخن کے بلبل آئے
نغمہ سنجی کا جوش دکھائے۔

روز بروز مذاق بڑھتا گیا اور بے تکلفی نے شعرا
عرب کی زبان سے کہلا دیا کہ ہمارا معشوق ویر کا ایک خوبصورت لڑکا
ہے جو نصرانی ہے اور اس کے شوق میں ہم صلیب پرستی کو تیار ہیں۔ بیان
تک کہ مدرک بن علی شیبانی جو ایک بڑا صاحب فہم شاعر اور زبردست
ادیب تھا اور اسلامی دنیا میں وقعت و وقار پیدا کر چکا تھا عمر بن یحنا
نام ایک خوبصورت مسیحی لڑکے پر عاشق ہو گیا جو سریانی بغداد کی مشہور
خاتقاہ ”دیر روم“ میں رہا کرتا تھا۔ مدرک نو عمر لڑکے کو درس دیا
کرتا تھا اور اُسکی درس گاہ میں یہ مسیحی لڑکا بھی آتا تھا۔ ملا مدرک صاحب
بڑھاتے بڑھاتے اس پر عاشق ہو گئے۔ اور عشق نے اس قدر بنیاب
کیا کہ ایک دن اشنا سے درس میں آپ نے ایک رقعہ گم کے اس
کی طرف پھینکا جس میں دل کی بقراری و بیتیابی کو صاف صاف ظاہر
کر دیا تھا۔ عمر بن یحنا کو وہ رقعہ پڑھ کے ایسی شرم آئی کہ اُن کی درس
گاہ میں آنا ہی چھوڑ دیا۔ اب مجبوراً ملا صاحب معشوق کی زیارت کے
لیے دیر میں پہنچنے لگے۔ اُس نے وہاں بھی ان سے ملنا ترک کر دیا تب
ملا صاحب بیمار پڑ گئے۔ ہوش و حواس میں فرق آ گیا۔ اور حالت ایسی
نازک ہوئی کہ لوگ گھر گھر کے اُس لڑکے کو بغرض عیادت لے آئے۔ ملا
صاحب نے معشوق کی صورت دیکھتے ہی چند شعر حسب حال پڑھے۔
اور ایک آہ کے ساتھ جان دیدی۔ جس کا بڑا اثر پڑا۔ اور اُن کا
عشق عشق صادق قرار پا کے اسلامی صحبتوں میں غیر میسب خیال
کیا جانے لگا۔

اُن ملا صاحب نے اپنی ساری شاعری اسی نصرانی معشوق
کے فراق کی شکایت میں صرف کر دی ہے۔ خصوصاً ان کا محض تو بہت

مقبول ہوا جس میں اُنھوں نے مسیحوں کے تمام عقائد و خیالات اور اُن کے مقتداؤں اور معبدوں کا ذکر کیا ہے۔ پہلے کہتے ہیں کہ میرا گناہ صرف اتنا ہے کہ مسلمان ہوں لیکن میرے افعال نے میرے اسلام کو ایسا ناقص کر دیا ہے کہ اس کی شکایت ہی کیا؟ پھر کہنا شروع کیا ہے کہ کاش میں صلیب ہوتا کہ وہ اُسے چومتا۔ اس کا زنا رہتا کہ اس کی کمر میں لیٹا رہتا۔ اس کا کرتا ہوتا کہ سینے سے لگا رہتا۔ اس کا پاؤں ہوتا کہ اُس کی ٹانگوں کو اپنے آغوش میں لیے رہتا۔ اُس کا کینسہ ہوتا۔ اس کی انجیل ہوتا۔ پھر اس کے بعد اسے باپ بیٹے روح القدس، "حضرت مریم" حواریوں۔ ستر دا عیون۔ مسیحی دلیوں اور راہبوں اور خدا جانے کن کن چیزوں کا واسطہ دلایا ہے کہ مجھ پر ترس کھا۔

اب اس زمانے میں اکثر عربی شعرا کا کوئے جانان کوئے دیر اور گر جاتھا اور اُن کا معشوق کوئی نصرانی لڑکا۔ ابن المعتز عباسی جو عہد مولدین عرب کا بڑا مقبول عام شاعر تھا اپنی ایک دلچسپ نظم میں کہتا ہے:-

"دیر عبدون برا در طیور کے اُس نشیمن پر جس میں خوب سایہ دار اور گھنے درخت ہیں گھنگھو گھٹا برسی۔ اور اکثر یہ ہوا ہے کہ صبح تڑکے ہنوز چڑیاں اپنے نشیمنوں سے نہیں اڑنے پائی اُنھیں کہ راہبان دیر نے اپنی عبادت کی صداؤں سے مجھے جام صبوحی پینے کے لیے جگا دیا (کون سے راہبان) جو سیاہ قبا میں پہنے ہیں صبح کے وقت زور و شور سے ضربیں لگاتے ہیں۔ کروں میں زنا رہا باندھے ہیں۔ اور سردن پر اپنے بالوں سے اُنھوں نے تلج سے بنا لیے ہیں۔ اُن میں سے اکثر خوب روہیں جن کی آنکھوں میں سر کا نرمہ لگا ہے۔ اور بلکین آنکھوں کی براق سفیدی دیا ہی پرانی حلبین ڈالے ہیں (ان میں سے ایک کو میں نے ایسے شوق کی نظر سے دیکھا کہ راضی کر کے اشارے اشارے میں ملاقات کا وعدہ لیا اور (وعدے کے مطابق) وہ رات کے کرنے میں بدن چڑاے اور کسی تمام کے خوف سے جلدی جلدی

قدم اٹھاتا ہوا آیا۔ میں نے شوق استقبال میں عاجزی کے ساتھ اپنے رخسار پر
بچھا دیے۔ اور اس طرح دامنوں کو زمین پر کھینچنا ہوا چلا کہ اس کے نقش قدم
سنتے جاتے تھے۔ ہلال آسمان پر چمک رہا تھا اور ڈر معلوم ہوتا تھا کہ یہ ہمیں رسوا
نہ کر دے۔ اور بعینہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کسی کا ناخن کٹ کے الگ ہو گیا ہو۔
پھر اس کے بعد جو ہوا سو ہوا۔ میں اُس کا ذکر نہ کروں گا۔ بس تو نہ بدگمانی کر
اور نہ پوچھ۔“

اب ہم قدامت کا اتنا اثر ضرور باقی تھا کہ عورت معشوقان میں بالکل
نہیں چھوٹنے پائی تھیں اور اس عہد کے شعراء عرب کی یہ حالت ہے کہ اُن کا
معشوق کوئی معین و مخصوص شخص نہیں ہوتا۔ جسے کبھی وہ عورت بتاتے ہیں اور
کبھی مرد۔ جب عورت ہوتی ہے تو عموماً اُن کے چچا کی بیٹی ہوتی ہے لیکن جب وہ
مرد ہوتا ہے تو اکثر وہ اُسے کسی دیر میں جانے کے ڈھونڈتے ہیں۔

اسی زمانے سے فارسی شاعری شروع ہوئی اور اُسے چونکہ عربوں
کے ”ہوم“ وطن سے تعلق نہ تھا اس لیے وہ پرانی رفیق چچا کی بیٹی گمراہی میں چھوٹ
گئی جس نے اپنے صحرائی خیون کو نہ چھوڑا اور انھیں بھی اُس سے کچھ سرد کا نہیں
رہا۔ اس لیے اب اس فارسی شاعری کا معشوق وہی خوبصورت اردکار رہ گیا جو
پہلے پہل دیر میں ملتا تھا اور چونکہ سلمان شعر کو شعر و سخن کی معرفت کا فرد
کے بعد دونوں میں جانے کی عادت پڑ گئی تھی اس لیے وہ ایران میں دیر
نضاری کے عوض آتش پرستوں کے کشت کھنکھناتے ہوئے تھے یہ ہمیں نہیں معلوم
کہ ان دنوں کشتوں کی کیا حالت تھی۔ خدا جانتے دیروں کی طرح وہاں بھی
عاشقانہ دلچسپیوں کا سامان تھا یا نہیں۔ لیکن کفرستان میں جانے کی عادت
شعرا کو اکثر کشت میں لے گئی خصوصاً اس چیز نے آتش پرستوں کے مہر سے
زیادہ مالوس کر دیا کہ شراب جو شام و بعداد میں نضاری کے ہاتھوں سے ملتی
تھی بیان صرف زرتشتی عقائد والوں سے ملتی۔ چنانچہ میرزا نادر کی خدمت
میں حاضر ہونے کے بعد کبھی کبھی انھوں نے یہ بھی قبول کیا کہ ہمارا معشوق کشت میں
ہے۔

اب شعراے عجم اپنے کفر کی آزاد دیون میں اور آگے بڑھے۔ ایرانیوں کو چین والوں سے پڑانی رہتا تھا۔ وہ چین کی نقاشی و صورت گری کے قائل تھے خصوصاً تانی کے واقعات سے ان میں چین کی مصوری کا بڑا شہرہ ہو گیا تھا اس شہرت نے انھیں چین کے بت خانوں کا شوق دلایا۔ اور بغیر اس بات کے معلوم کیے کہ چینیوں کے بت خانوں میں دراصل کیا ہوتا ہے۔ انھیں اُن خیالی تصویروں کا شوق ہوا۔ جو اُن کے خیال کے مطابق بت خانہ ہائے چین میں تھیں۔ اس نئے خیال کا آنا تھا کہ فارسی شعرا میں بت خانوں کا چرچا ہونے لگا۔

اسی اثنا میں مسلمانان عجم ہندوستان میں آئے۔ اور اردو زبان پیدا ہوئی۔ اور اُس کی شاعری نے فارسی شاعری کے آغوش میں پرورش پائی اسی فارسی شاعری کی معرفت وہ کینسہ ہائے شام کا کافر جبرائیل معشوق اردو شعرا کو مل گیا جسے مسلمان لائے تو باہر سے تھے۔ مگر اس کا مسکن یہاں نہ گرجا رہا نہ کشت بلکہ ہندوستان کے بچانے ہو گئے۔ شعراے فارسی کی تقلید میں وہ معشوق کی جستجو کرتے وقت کبھی کبھی دیر و کشت کو بھی جھانک کے دیکھ لیا کرتے ہیں مگر اب ان کا اصلی رجحان بت خانوں کی طرف ہے۔ بت پرستی کے تمام شعائر اُنھوں نے اختیار کر لیے ہیں اور بت ہی کو اپنا اصلی معشوق بتاتے ہیں۔

ایرانیوں ہی کی تقلید میں اردو کا معشوق بت ہونے کے ساتھ ایک خوبصورت لڑکا ہے۔ عورت کے حسن سے انھیں سرور کا رہنمائی اور بڑی حیرت کی بات ہے کہ جن بت خانوں میں اپنے بُت دربار کو بتاتے ہیں ان میں دیوتاؤں کی بھی صورتیں ہیں۔ اور دیویوں کی بھی۔ مگر دیوتاؤں کی صورتیں عموماً عظمت و جبروت اور قوت و طاقت کا نمونہ ہوتی ہیں۔ اُن کے بہت سے ہاتھ اور کئی سر ہوتے ہیں۔ وہ ایسے رعب و داب کے مظہر ہوتے ہیں جنھیں دیکھ کے بجائے عشق و محبت کے ان سے خوف اور ڈر معلوم ہوتا ہے۔ ان دیویوں کی صورتیں البتہ حسن و جمال کی مکمل تصویریں ہوتی ہیں۔ اس لیے ان بت کدوں میں اگر معشوقیت کی شان ہے تو دیویوں میں۔ لیکن ہمارے شعرا کو ان سے سروکار نہیں وہ بے دیکھے بھالے اور بے سوچے سمجھے اپنے استاد شعراے فارسی

کی اندھی تقلید میں ان بت خاؤن کے مرد معشوقوں ہی پر عاشق ہیں۔
یہ ہے تاریخ ہمارے شعراء اسلام کے معشوق کی۔ جوان کے دلون
میں ہے۔ اور پھر بھی جدا ہے۔ اور جسے وہ پہچانتے نہیں۔ مگر عاشق ہیں۔ یقیناً
کہ اس تاریخ کے پڑھنے سے یہ معہ خوبی حل ہو گیا ہو گا کہ ان کا معشوق کیوں
ایک خوبصورت لڑکا ہے۔ عورت نہیں؛ کیوں اس کے شوق میں وہ زیادہ تر
بتخاؤن کی طرف اور کبھی کبھی دیر و کشت میں جاتے ہیں؟ ہم انھیں اس جرمِ مفلات
وضع فطری میں مبتلا دیکھ کے افسوس کرتے اور پھپھاتے ہیں کہ کاش اگر سلسلہ نسب
کے دور پڑ جاتے سے پرانی بنت عم چھوٹا گئی تھی تو کوئی اس کی ہندوستانی بہن ہی
معشوقہ بن جاتی۔ یا اگر ہندوستان کے اثر سے ہمارے شعراء میں مردانگی کی قوت
بالکل فنا ہو گئی تھی۔ تو وہ ہندی شعراء کی طرح عورت بن جاتے۔ اور عورت بن لینے
کے بعد کسی مرد کو اپنا معشوق بناتے۔ مگر آہ! نہ یہ ہوا اور نہ وہ ہوا۔ اور محض مجرمین
کی کثرت کی وجہ سے ہماری فیاض گو رنشت کو ہمارے ان لمزمان جرم وضع مفلات
فطری کو تفریات ہند کی دفعہ ۷۷ کے اثر سے مستثنیٰ کرنا پڑا۔

ساریۃ الجبل

یہ وہ الفاظ ہیں جو ایک مرتبہ دوران خطبہ میں حضرت عمر فاروق
رضی اللہ عنہ کی زبان مبارک سے بے اختیار نکل گئے۔ جبکہ آپ مدینے میں تھے
اور یہی الفاظ اسی وقت سبز میں ایران میں منے گئے۔ اس کی اتنی شہادتیں
ہیں۔ اور ایسے ایسے معتبر مورخین راوی ہیں کہ اس واقعے سے کسی طرح
انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عمرؓ میں بے انتہا فضل
جمع کر دیے تھے اور ان کے ہاتھوں اسلام کو وہ خوبیاں حاصل ہوئیں کہ ان
کا شمار مشکل ہے۔

حضرت عمرؓ نے ایران پر فوج کشی فرمائی تو مختلف سرداروں کو
مختلف مقامات کے جھنڈے مرحمت فرمائے۔ چنانچہ آپ نے ساریہ بن نہیم کو

قسا اور ڈار اگر دکی جانب روانہ فرمایا۔ حضرت ساریہ یہ جھنڈا لے کر روانہ ہوئے۔ اور مملکت ایران میں داخل ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ ایک زمانہ دراز تک ایرانیوں کا محاصرہ کیے پڑے رہے۔ یہ دیکھ کر ایرانیوں نے اور اور سے مدد طلب کی اور اُن کی بہت سی فوجیں جمع ہو گئیں۔

اب ساریہ اور اُن کے ساتھی مسلمان سخت مصیبت میں مبتلا تھے اور ایرانیوں نے اُنہیں گھیر لیا تھا۔ حضرت عمرؓ مدینہ طیبہ میں تشریف رکھتے تھے۔ آپ نے خواب میں دیکھا کہ مسلمانوں اور ایرانیوں میں جنگ ہو رہی ہے۔ صبح کو آپ اُٹھے تو مدینہ میں پکروا دیا کہ "الصلوة جامعة"۔ اور لوگ جمع ہونے لگے۔ جب وہ وقت آیا جو آپ نے خواب میں دیکھا تھا تو آپ باہر تشریف لائے۔ حضرت ساریہ بن زبیم اور مسلمانوں کی حالت میدان جنگ میں اس وقت بہت نازک ہو رہی تھی۔ وہ ایک ایسے جنگل میں تھے کہ اگر ذرا دیر بھی اُس میں اور ٹھہرتے تو ایرانیوں میں بالکل مگر جاتے اور پھر جان بچنے کی کوئی صورت نہ رہتی۔ اُن کے پیچھے ایک ہار تھا۔ اگر وہ اس ہار پر چڑھ جاتے تو پھر فقط ایک ہی سمت سے ایرانیوں کا مقابلہ کرنا پڑتا۔

غرض اُس وقت حضرت عمرؓ ممبر پر تشریف لائے اور تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ میں نے ان دونوں لشکروں کو خواب میں دیکھا ہے اور اب اُن کی مفصل حالت تم سب کے سامنے بیان کرتا ہوں: آپ نے اپنی تقریر میں یہیں تک فرمایا تھا کہ دفعہ آپ زور سے پکار کے فرمانے لگے "ساریہ الجبل" "ساریہ الجبل" یعنی ساریہ ہار کا رخ کرو! ساریہ ہار کی طرف جاؤ! یہ معلوم ہوا کہ جیسے میدان جنگ کا نقشہ آپ کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ اور آپ نے موقع کے لحاظ سے ساریہ کو یہ ہدایت فرمائی۔ یہ کہنے کے بعد آپ پھر تقریر کرنے لگے اور فرمایا کہ خدا کے بہت سے لشکر ہیں بہت ممکن ہے کہ اُن میں سے کوئی میری ہی آواز نہ ساریہ تک پہنچا دے اور مسلمان تباہی سے بچ جائیں۔ اور خدا کی قدرت سے ایسا بھی ہوا۔ یہ آواز حضرت ساریہ اور اُن کے ساتھیوں نے سنی اور ہار پر چڑھ کے مقابلہ کرتے لگے اور

اسی کا نتیجہ تھا کہ آخر میں خدا نے ایرانیوں کو شکست دی اور مسلمانوں کو فتحیاب کیا۔

مارتخ کاکل ابن اشیر نے بھی یہ واقعہ لکھا ہے اور بہت سے

ائمہ حدیث نے بھی مختلف صحیح سندوں سے روایت کیا ہے جن میں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر یہ تھی۔ ابو نعیم۔ ابن مردویہ۔ لاکائی۔ ابن اعرابی اور حطیب بن۔ ان بھوں نے اس واقعہ کو مختلف الفاظ میں بیان کیا مگر مطلب سب کا ایک ہی ہے۔ چنانچہ ان روایتوں میں ایک روایت جناب ابن عمر سے ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے ایک لشکر روانہ کیا۔ اور اُس کا سردار ایک شخص ساریہ نامی کو بنایا۔ یہ لشکر روانہ ہو چکا تھا کہ ایک دن حضرت عمرؓ رضائے تقریر میں فرماتے لگے۔ "یاساریۃ الجبل۔ یاساریۃ الجبل۔ یاساریۃ الجبل" اس کے کچھ روز بعد اسی لشکر کا ایک قاصد حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے اُس سے لشکر کا حال پوچھا۔ اس نے عرض کیا امیر المؤمنین ہم نے دشمنوں کو شکست دی۔ جس عرصہ میں ہم لوگ لڑ رہے تھے ہم نے تین ہزار آدمی ساریہ نامی کو بنایا۔ تو ہم لوگ پہاڑ پر چڑھ گئے۔ اور پھر ہم نے دشمنوں کو ہٹا دیا۔ حضرت عمرؓ کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ یہ آدمی آپ ہی کی فوجی اور وہ پہاڑ جس کے پاس ساریہ تھے ملک ایران میں شہر تہماوند کے قریب تھا۔

ایک دوسری روایت ان ہی حضرت ابن عمرؓ سے ہے کہ حضرت عمرؓ ایک روز جمعہ کا خطبہ پڑھ رہے تھے۔ خدا معلوم کیا بات پیش آئی کہ آپ فرماتے لگے۔ "اسے ساریہ پہاڑ کی طرف جاؤ۔ جو شخص بھڑیوں کو حرا نا چاہتا ہے اپنے اوپر ظلم کرنا ہے۔" اس پر لوگوں کو تعجب ہوا اور سب ایک دوسرے سے سرخوشیاں کرنے لگے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ پوچھنا چاہیے۔ یہ آپ نے کیا کہا۔ لوگوں نے حضرت عمرؓ سے پوچھا تو آپ فرماتے لگے کہ مجھ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ مشرکین نے ہمارے مسلمان بھائیوں کو شکست دیدی اور وہ ایک پہاڑ کی طرف جا رہے ہیں۔ اگر پہاڑ کے اوپر پہنچ جائیں گے تو ان کو صرف

ایک سمت سے مقابلہ کرنا پڑے گا اور اگر اس مقام سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں گے تو ہلاک ہو جائیں گے۔ اس خیال سے بے اختیار میرے مونہ سے وہ الفاظ نکل گئے جو آپ لوگوں نے سنے اس کے ایک مہینے کے بعد ایک شخص اس لشکر سے فتح کی خوشخبری لے کر آیا تو اس نے کہا کہ ہم نے اسی دن حضرت عمرؓ کی آواز سنی اور اسی کے مطابق ہم پہاڑ کے اوپر چڑھ گئے پھر خدا نے ہمیں کامیاب کیا۔

عمر بن حارث سے ایک روایت ان الفاظ میں ہے کہ حضرت عمرؓ جمعہ کا خطبہ پڑھ رہے تھے کہ آپ نے خطبہ چھوڑ دیا اور دفعۃً فرمانے لگے ”یا ساریۃ الجبل“ یہی الفاظ آپ نے دوبار یا تین بار فرمائے اور پھر خطبہ پڑھنے لگے۔ اس پر لوگوں کو تعجب ہوا اور بعض حاضرین کہنے لگے کہ آپ بہکی ہوئی باتیں کر رہے ہیں۔ لیکن حضرت عبدالرحمن بن عوف کو آپ کے متعلق اطمینان تھا۔ وہ کہتے تھے کہ کوئی خاص بات ہے۔ جب آپ خطبہ ختم کر چکے تو وہی عبدالرحمن آپ کے پاس آئے اور عرض کیا آپ نے اثنائے خطبہ میں فرمایا ”ساریۃ الجبل“ اس کا کیا مطلب ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ خدا کی قسم میں اپنے اختیار میں نہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ مسلمان ایک پہاڑ کے قریب گڑھے میں ہیں۔ اور دشمن اُن کے سامنے اور پیچھے سے آ رہے ہیں۔ تو میں نے اختیار ہو گیا۔ اور میں نے پکار کے کہہ دیا ”یا ساریۃ الجبل“ تاکہ وہ لوگ پہاڑ پر چڑھ جائیں۔ جہاں اُنھیں فقط ایک ہی جانب سے دشمنوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ اس کے چند روز بعد ساریہ کا قاصد اُن کا خط لے کر آیا۔ جس میں لکھا تھا کہ ایرانیوں سے ہم سے جمعہ کے دن مقابلہ ہوا۔ ہم اُن سے لڑ رہے تھے کہ جمعہ کی نماز کا وقت آگیا۔ ہم نے دو تین بار ایک ایک نیاوالے کی آواز سنی کہ ”یا ساریۃ الجبل“ اور ہم پہاڑ پر چڑھ گئے۔ اس نے بعد ہم دشمنوں پر برابر غالب ہوتے رہے یہاں تک کہ خدا نے اُنھیں شکست دی اور وہ قتل ہوئے۔

اس جنگ میں مسلمانوں نے دیگر مال غنیمت کے ساتھ ایک صندوق

پایا جن میں جو اہرات بھرے ہوئے تھے سب نے وہ صندوق حضرت ساریہ کو دے دیا۔ ساریہ نے اس کو حضرت عمرؓ کی خدمت میں بھجوا دیا۔ جس وقت قاصد اُسے لے کے بارگاہ خلافت میں پہنچا تو حضرت عمرؓ کھانا کھا رہے تھے۔ آپ نے قاصد سے کہا بیٹھو کھانا کھاؤ۔ جب کھانا کھا کے اُٹھے تو وہ بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ آپ نے خیال کیا کہ اس نے ابھی سیر ہوئے نہیں کھایا ہے تو آپ اُسے اپنے ساتھ گھر کے اندر لے گئے۔ اور تھوڑی دیر میں تھوڑا سا کھانا لاکر رکھ دیا گیا۔ دو دنوں میں مل کر پھر کھانا کھانے سے فرصت پا کے اُس شخص نے کہا "امیر المومنین میں ساریہ کا قاصد ہوں۔ آپ نے فرمایا "مرجا" خوش آمدید پھر آپ اُس کے پاس گھٹنے سے گھٹنا ملا کے بیٹھ گئے۔ اور مسلمانوں کی خیریت پوچھی۔ اُس نے حالات بیان کیے۔ اور صندوق کا واقعہ کہا۔ اس کو سن کر آپ چلائے اور فرمانے لگے کہ اس کو میں نہیں لون گا۔ اسے رکھ لو جب وہ لشکر واپس آئے گا تو یہ انہیں لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ اُس نے عرض کیا "امیر المومنین میرا اونٹ کمزور ہو گیا ہے اور مال غنیمت کے بھروسے پر میں قرضدار ہو گیا ہوں۔ اس میں سے کچھ مجھے مرحمت ہو جائے تو میں دو سر اونٹ خرید لوں۔ آپ نے اس کا اونٹ صدقہ کے اونٹوں میں سے بدلوادیا۔ وہ واپس جاتے لگا تو مدینہ کے لوگوں نے اُس سے پوچھا کہ تم نے جنگ کے دن کوئی آواز سُنی تھی۔ اُس نے کہا ہاں۔ ہم نے سنا "یا ساریہ الجبل" اس وقت ہم سب ہلاکت کے قریب پہنچ گئے تھے۔ مگر جب ہم نے یہ آواز سُنی تو ہمارے پر چڑھ گئے۔ اور اس تدبیر سے خدا نے ہمیں کامیاب اور فقیہ کیا۔

ریو ریو

حرم۔ یہ زمانہ لڑیج کا ماہوار رسالہ ہے۔ جس کی ایڈیٹر ڈاکٹر بیگم عبدالغفور صاحبہ لیدی ڈاکٹر ایل ایم پی۔ ہیں۔ جو نہایت ہی توجہ سے اسے مرتب فرماتی ہیں۔

اس وقت اس کا یکجائی نمبر ۷۰۰ بابتہ ۱۰ اگست دسمبر ۱۹۲۷ء ہمارے سامنے ہے جس میں عورتوں کے مضامین کے علاوہ شاہیر مردوں کے بھی متعدد مضامین بن کاغذ سفید لکھائی چھپائی عمدہ تقطیع ۲۰۰۰ اور حجم ان دو نمبروں کا ۸۴ صفحہ ہے۔ قیمت تین روپیہ سالانہ ہے جو پیشگی وصول کی جاتی ہے۔ یہ قیمت اس رسالے کے اجرا کے اس مقصد پر نظر ڈالتے ہوئے کہ "اس سے جو کچھ آمدنی ہوگی وہ غریب اور بیمار عورتوں کے علاج پر صرف کی جائے گی" کسی طرح زائد نہیں ہے۔ اس رسالے میں دیگر مضامین نگاروں کے علاوہ جناب علامہ سید مولوی محمد عبدالودود صاحب بریلوی اور جناب شیخ عبداللہ صاحب بی اے ایل ایل بی اور جناب نذر سجاد حیدر صاحبہ کے ایسے شاہراہی قلم کے کلمے ہوتے ہیں۔ ناظرین ذیل کے پتہ سے طلب فرمائیں۔

ڈاکٹر بیگم عبدالغفور صاحبہ۔ ایل ایم پی۔ محلہ تھان پٹی بھیت۔

لوہی

ڈاکٹر۔ یہ ہو میو پیٹھی کا ایک دلچسپ رسالہ ہے جس کے ایڈیٹر جناب ڈاکٹر نظام الدین صاحب۔ ایم بی۔ ہو میو ہیں۔ اس رسالے کے اجرا کا مقصد یہ ہے کہ علاج ہو میو پیٹھک سے ہر خاص و عام واقف ہو جائے۔ مریضوں کے اسباب اور اس کا طریقہ علاج بہت خوبی سے درج کیا جاتا ہے ۲۲ x ۱۸ کی تقطیع کے ۸۴ صفحات ہوتے ہیں۔ اور چند سالانہ صرف ۱۰ روپے۔ نمونہ کا پرچہ بلا قیمت روانہ ہوتا ہے۔ خریداری کے واسطے نمبر سالہ ڈاکٹر پوسٹ بکس نمبر ۷۰۰ لاہور کے پتہ پر مراسلت کی جائے۔



انگلستان کی عورتیں

(مولانا مولوی محمد عبدالحلیم صاحب شہر مرحوم دمغفور)
 ذیل کا مضمون مولانا مرحوم کا ایک لکچر ہے جو آپ نے انگلستان سے واپس
 تشریف لانے کے بعد ہی قید رآباد کے ایک بہت بڑے جلسے میں ارشاد
 فرمایا تھا۔ یہ غالباً ۱۹۲۷ء کا واقعہ ہے اور مضمون کی مناسبت کے لحاظ سے
 قید رآباد وکن کے مرحوم رسالہ معلم نسوان میں شائع ہوا تھا۔ میں مولوی
 محبت حسین صاحب ایڈیٹر رسالہ معلم نسوان کا بہت ممنون ہوں کہ انھوں
 نے اپنی ہربانی سے اس مضمون کی ایک نقل مجھے مرحمت فرمائی۔ میں اب اسے
 صرف اس غرض سے شائع کرتا ہوں کہ مولانا مرحوم کا اس قسم کا کل متفرق لکچر
 دنگلاز کے صفحات پر جمع ہو جائے۔ اس کے علاوہ دنگلاز کے ناظرین میں سے
 بہت کم ہوں گے جنھوں نے اسے دیکھا ہو۔

آخر میں ایک بات مجھے خاص طور پر عرض کرنی ہے کہ اسے پڑھنے وقت
 اس بات کو مزور مد نظر رکھا جائے کہ یہ اب سے تیس سال قبل لکھا گیا تھا
 اور اس وقت میں اور اب میں زمین و آسمان کا فرق ہو گیا ہے۔ اس میں
 تیس سال قبل کی انگلستان کی عورتوں کی ایک جیتی جاگتی تصویر نظر
 آ جائے گی۔

محمد صدیق حسن ایڈیٹر

جناب پریسڈنٹ اور حاضرین جلسہ میں آج اپنے بعض معزز اور پرہیزگار دوستوں

کی خواہش کے مطابق انھلستان کی عورتوں کے متعلق کچھ حالات بیان کرنے اور ان کے طرز عمل اور معاشرت پر اپنے خیالات ظاہر کرنے کی غرض سے کھڑا ہوا ہوں جان تک میں خیال کرتا ہوں یہ ایک نہایت ہی نازک اور شوارہ جھگڑ ہے۔ بات یہ ہے کہ اخلاق انسانی میں سے جو اوصاف کہ نظام عالم کے قائم رہنے اور دنیا میں ایک بے ضرر زندگی بسر کرنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ تو ہر ملک اور ہر قوم میں قریب قریب متحد ہیں۔ چوری سب جگہ منع ہے زنا کاری ہر جگہ حرام ہے۔ فریبی اور کینا دہر جگہ ذلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ مگر وہ اوصاف جن کو دنیا میں بود و باش کرتے۔ باہم ملنے جلنے۔ اور شادی بیاہ کی تقریبوں سے تعلق ہوتا ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ ہر جگہ بدلے ہوئے ہیں۔ اور یہی چیزیں ہیں جن کا اعتبار سے ہر قوم کچھ اپنی خاص عادات و اطوار رکھتی ہے۔ اور یہ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن پر فلسفہ اور تمدن سب کا بہت کم اور دیرین اثر پڑتا ہے۔ بلکہ تمدن اور حکومت میں ترقی ہونے کے بعد ہر قوم کی عموماً یہی خواہش ہوتی ہے کہ اپنے طرز عمل اور طریقہ زندگی کو شائستگی کا معیار قرار دیدے۔ چونکہ یہ معیار کسی فلسفی اصول اور عقلی استدلال پر نہیں قائم کیا جاتا ہے لہذا دوسری قومیں اس کی پیروی میں بھی اتنی پیش قدمی نہیں کرتیں جتنی کہ کسی سائنس اور فلسفہ کے اصول کے اختیار کرنے یا عام اصول اخلاق کے اخذ کرنے کے لیے سرگرمی دکھاتی ہیں۔ اس اصول کو آپ خود اپنے ملک میں دیکھ رہے ہیں کہ مغربی فلسفہ قریب قریب سارے ہندوستان کا مذہب ہو گیا اور ہوتا جاتا ہے۔ جدید سائنس جو یورپ سے آیا ہے۔ اس میں ترقی کرنے کا کون ہے۔ جو مشتاق نہیں۔ مگر انگریزی طرز معاشرت آج بھی ہندوستانی گھروں کے دروازوں سے اتنی دور ہے جتنی دور کہ سو برس پہلے تھا۔ یہ انگریزوں کی حقیقی معاشرت نہیں ہے جو آپ دیکھتے ہیں کہ ہمارے بہت سے دوست کوٹ پتلون پہنے ہوئے ہیں۔ یا اکثر اہل اسلام اور ہموطنوں کی جسم پر شیر و انان ہیں جو انگریزی ہی وضع کی متابعت میں ایجاد کی گئیں یا اس سے بھی بڑھ کر کہہ دیا جائے کہ بعض ہندوستانی شریف زادیاں انگریزی گون پہنے لگی ہیں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ انگریزوں کی معاشرت ہے۔ ان کی حقیقی معاشرت یہ ہے کہ عورتیں کس حال میں رہتی ہیں۔ اور ان کے مرد اپنی عورتوں میں اور اپنے گروں کے اندر کیسی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کے بیان شادی بیاہ میں کیا ہوتا ہے۔ اور

شادی کیونکر ہوتی ہے۔ بچہ کیونکر پرورش پاتے ہیں۔ اور دنیاوی معاشرت میں مرد کے فرائض منصبی کیا ہیں۔ اور عورت کن کن کاموں کی ذمہ دار ہے۔

آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ ان باتوں میں آپ کی معاشرت بورو میں معاشرت سے اس وقت تک بالکل جدا ہے۔ طرز معاشرت کا اثر اتنا گہرا ہوتا ہے کہ اپنی معاشرت کی خوبیاں دل پر نقش ہو جاتی ہیں۔ اور انسان تمام دوسری قوموں کی زندگی کو اپنے خیال میں بالکل جانوروں کی زندگی سمجھ لگتا ہے۔ اس کا تعصب انسان کے دل میں مذہبی تعصب سے بھی کسی قدر زیادہ ہوتا ہے۔ جس کا یہ نتیجہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسری قوم کی معاشرت میں کوئی امر تسلیم کرے یہ درکنار اس کے طریقہ زندگی کو صحیح طور پر سمجھ بھی نہیں سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ انگریز سو برس تک ہندوستان میں رہنے کے بعد بھی ہندوستانی معاشرت کی بعض سلسلہ خوبیوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ اسی طرح بہت کم ہندوستانی ہیں جو انگریزوں کی معاشرت کو اچھی طرح جانتے ہوں اور اس وجہ سے میرا خیال ہے کہ انگریزوں کی معاشرت اور خاصہ معاشرت کا وہ حصہ جو اس ترقی یافتہ قوم کی عورتوں سے تعلق رکھتا ہے۔ مشکل ہے کہ آپ کو پسند آئے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ باوجود اس مخالفت و نفرت کے دونوں طرف میں تفتیش حالات کا شوق کمسان پا۔ ماہوں جس طرح آپ انگلش عورتوں کے حالات سننے اور معلوم کرنے کے مشتاق ہیں اس سے زیادہ مشتاق میں نے انگریزوں کو اور خاصہ وہاں کی عورتوں کو پایا جو ہر وقت اپنی ہندوستانی بہنوں کے حالات ہی پوچھا کرتی ہیں۔ مذکورہ بالا اختلاف مذاق کی دشواری کی علاوہ ہندوستان میں انگلش معاشرت اور خاصہ وہاں کی عورتوں کی نسبت بہت سی بے سرو پا باتیں مشہور ہیں اور اس قدر مشہور ہیں کہ دونوں پر نقش ہو گئی ہیں مجھے مشکل نظر آتا ہے کہ ان بے بنیاد واقعات و حالات کے خلاف میں کچھ بیان کر دوں تو بایہ قبول کو پہنچے۔

اس سے پیشتر ایک کچر میں میں انگریزوں کی بہت سی اخلاقی باتوں کو ظاہر کر چکا ہوں

۱۵ اس کچر کے متعلق میں نے بہت دریافت کیا۔ مگر بالکل پتہ نہیں چلتا۔ ممکن ہے کہ شائع ہونا ہوا ہو۔ یا مولانا مرحوم مغفور نے بغیر لکھنے زبانی ارشاد فرمایا ہو۔

محمد صدیق حسن

اگرچہ ان باتوں کو بھی انگلش معاشرت سے بہت کچھ تعلق تھا۔ لیکن وہ اس قسم کے امور تھے جن کی خوبی کو غالباً ہر شخص نے تسلیم کر لیا ہو گا۔ اور جائز ہے کہ بغیر وجہ اور اسباب دریافت کیے اُن باتوں پر ہر ہندوستانی شخص آنکھیں بند کر کے عمل کرے مگر آج چونکہ میں انگلش عورتوں کے حالات ظاہر کرنے کے لیے کھڑا ہوا ہوں لہذا اس حصہ معاشرت سے بحث کرتا ہوں جس کو زیادہ تر رسم و رواج سے تعلق ہے۔ اور ضرور نہیں کہ ان میں سے ہر بات کی پیروی اور پابندی بھی کی جائے۔

اس موقع پر مجھے ایک اہم تاریخی واقعہ کے پیش کرنے کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے کہ بغیر اس کے بیان کیے۔ دنیاوی معاشرت کا مسئلہ اچھی طرح حل نہیں ہو سکتا۔ اصل یہ ہے کہ جس وقت خدا کا خاص دین یعنی اسلام روئے زمین پر ظاہر ہوا ہے۔ اس وقت کہہ زمین کے مشرقی رخ یعنی ایسٹرن ہمسفر کے اس تمام حصہ پر جو ہندوستان کے مغربی حدود سے لے کے انتہائے مغرب تک پھیلا ہوا ہے۔ صرف مذہب کی معاشرت کا اثر پڑا ہوا تھا۔ ایلائیون کا جو زرتشتی مذہب کے پابند تھے اور رومیون کا جو چند ہی صدی پیشتر سے دین مسیحی کو اختیار کر چکے تھے۔ اگرچہ یہودیوں کی قوم ایک خاص قسم کی خصائص قومی رکھتی تھی۔ مگر مسیحیت مسمت پہلے ہی اُس کا اثر مٹا چکی تھی۔ فتوحات اسلام کے بعد زرتشتی مذہب کے ساتھ اُنس کی معاشرت بھی مٹ گئی۔ اور اسلامی معاشرت جو مذہبی احکام عرب کے قومی خصائص اور ایلائیون کے اس اثر سے جو عباسیہ کے دور پر وقتاً فوقتاً پڑتا رہا مگر کب بھی تو رہا کہ سوا تمام حصہ زمین پر اثر کر گئی۔ صرف ہی نہیں ہوا کہ مسلمان قوموں ہی میں اس معاشرت کا رواج ہوا ہو۔ نہیں اُن غیر قوموں پر بھی اس کا اثر پڑا جو حکومت اسلام کے تابع ہیں۔ اگرچہ مختلف ملکوں کی آب و ہوا اور حقیقی حاجتوں نے ہر سرزمین کے مسلمانوں میں بھی بعض خاص قسم کے رسم و رواج جاری کر دیے۔ مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسلمانوں کو اخلاق میں چاہے وہ کسی حصہ زمین پر ہوں ایک گونہ مشابہت و موافقت پائی جاتی ہے۔ مسلمان ہی نہیں وہ غیر قومیں بھی جو اُن کے پاس آباد ہیں یا اُن کے ماتحت رہ چکی ہیں اپنے عادات و اطوار میں مسلمانوں کی بہت سی باتیں پائیں گی۔ ہر تقدیر ظہور

اسلام کے چند ہی روز بعد نظر آگیا کہ ساری دنیا پر اسلامی اور عربی معاشرت کا پورا اثر پڑا ہوا ہے۔ مگر پورے جہان دین بھی کا قدم بہت مضبوطی سے جما ہوا تھا۔ ہماری معاشرت سے بالکل متاثر نہ ہو سکا جس طرح اسلام کی اس تیرہ سو برس کی زندگی میں مذہبی حیثیت سے گراں اور گرسٹ یعنی صلیب و ہلال لڑتے رہے ہیں۔ اسی طرح ان دنوں کی معاشرت بھی باہم ایک دوسرے کی حریف رہی ہے۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہم انگلستان کی معاشرت کو اس قدر علیحدہ اور دور پاتے ہیں کہ ان کی کوئی بات اور کوئی رسم ہماری باتوں اور رسموں سے نہیں ملتی یہی پر وہ کا مسئلہ ہے کہ (رعان) کچھ میں اس موقع پر اس سلسلہ کے حل کرنے کے لیے نہیں کھڑا ہوا ہوں کہ یہ دسے کا ثبوت شریعت اسلام سے ہوتا ہے یا نہیں) عورتوں کو یہ دسے میں چھینا جا ہیے۔ تاریخی طور پر بتاؤ عہد قدیم کی کئی اور قوموں میں بھی پایا جاتا ہوا یا نہ پایا جاتا ہو۔ مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس رسم کو اسلام نے یہاں تک اختیار کیا کہ ہر حصہ زمین پر مسلمانوں کا ایک کڑا شک یعنی خصیصہ معاشرت ہو گئی۔ اور مسلمانوں کی وجہ سے ان تمام شرعی قوموں میں جن پر مسلمانوں کے معاشرت کا اثر پڑا ہے۔ ہر خاندان کا معیار شرافت ہی قرار پا گیا۔ آپ جانتے ہیں کہ مسلمان درکنار ہندوستان میں اور چند روز پیشتر گجرات کے پارسیوں تک میں یہ خیالی موجود تھا کہ جس خاندان کی عورتیں جہاں تک زیادہ عیروں اور نامحرموں سے چھپتی ہیں اسی قدر وہ خاندان زیادہ شریف اور ممتاز ہے۔ اسی طرح طہارت و نجاست کا مسئلہ ہے کہ دنیا کے جن جن حصوں پر اسلام کا اثر پڑا ہوا ہے ان میں طہارت کا وہی مفہوم اور وہی طریقہ ہے جو مسلمانوں میں مروج ہے۔ آپ اس پر فخر نہ کریں۔ اس لیے کہ زمانہ کی رفتار کا یہی تقاضا ہے۔ میں یہ بھی دکھا سکتا ہوں کہ بہت سی مسلمان قومیں جو مدت اے دراز تک عیسائیوں کے پڑوس میں رہی ہیں ان پر ان کا پورا پورا اثر پڑا ہوا ہے۔ جنوبی حصہ آرمین کے مسلمان جو مغلوں کے ساتھ صدیوں تک عیسائیوں میں رہے ہیں ان کی عورتوں میں بالکل یہ دسے کا رواج نہیں ہے۔

خلاصہ یہ کہ انگلش طرز معاشرت وہ خالص رومی یا عیسائی طرز معاشرت ہے جس پر کسی امر و رد کسی رسم میں آپ اپنا اثر نہ پائیں گے۔ آپ اپنے قرب و جوار کی تمام

قوموں اور ان کی عورتوں میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور پالین گے جو آپ کے مذاق کے موافق ہے۔ اور جس کے اعتبار سے آپ اپنے خیال کی شرافت کا تصور اس حصہ ان کو بھی دیدین گے مگر یورپ کی توہین اور وہاں کی عورتیں جس وضع کی زندگی بسر کر رہی ہیں وہ آپ کے معیار شرافت سے اس قدر جدا جاتی ہے اور یہاں تک علیحدہ رہتی ہے کہ مشکل ان مغربی خاتون کو آپ کی زبان سے کوئی تعریف کا لفظ نصیب ہوگا۔ تاہم زمانہ اب دنیا کی تمام قوموں کو ایک ہی پیش پیرا ہے۔ اور بتاؤ خیالات کے ساتھ قوموں میں باہمی تبادلہ مذاق و عادات بھی ہو رہا ہے۔ لہذا میں کمال ادب عرض کرتا ہوں کہ ان کی معاشرت کو ایک مسلمان کی نظر سے نہیں بلکہ ایک حکیم یا فلسفی یا ایسے شخص کی نگاہ سے دیکھئے جس کے دل پر کسی خاص مذاق اور معاشرت کا اثر نہ پڑا ہو اور وہ ساری دنیا کی قوموں کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہو۔ اگر آپ ان کی زندگی کو ایسی صاف اور سادی نگاہ سے دیکھیں گے تو بہت سے فائدہ اٹھا سکیں گے اس لیے کہ دنیا کی کوئی قوم نہیں جس میں صرف برائیاں ہی برائیاں ہوں ہر جگہ برائیوں کے دامن میں خوبیاں چھپی ہوئی ہیں۔ اور آپ کی تو اسلامی شان یہ ہونا چاہیے کہ **الحکمة ضالة المؤمنین فہو اخوہا حیث وجدھا** کسی تاریخی کتاب میں دیکھنا تو مجھے یاد نہیں مگر میں نے بعض لائق اجاب کی روایت سے سنا ہے کہ پہلے یہل انگریز جب ہندوستان کے ساحل پر اترے تو ان کو عورتوں کے نہ ہونے یا بہت کم نظر آنے پر تعجب ہو گیا اور خیال گزر ا کہ شاید اس ملک میں عورتیں نہیں ہوتیں۔ بخلاف اس کے انگلستان کے ساحل پر قدم رکھنے ہی ایک مشرقی شخص کو جو سب کے پہلے قابل حیرت چیز نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ مرد کم ہیں اور جدھر دیکھے زیادہ عورتیں ہی چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ عورتیں بھی کوئی معمولی قسم کی نہیں۔ یہ اماں صیلین اور مزدوریان نہیں جو آپ کو یہاں بھی مردوں کے غول میں ملی جلی نظر آ جاتی ہیں بلکہ وہ شریف عورتیں جو اپنے گھر دن کا نہ لوڑ اور اپنی قوم کی عزت ہیں اور جن کے شوہر آج اقصاء عالم میں پھیلے ہوئے ہیں اور ملکوں پر ملک فتح کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے لباس کے متعلق آپ کو میرے پہلے ہی لکھنے بتا دیا ہو گا کہ کس قدر صاف اور ستھر ہے۔ مگر اس موقع پر مجھے اس قدر زیادہ کہنا چاہیے کہ اس میں انتہا درجہ کابائت

اور حد درجہ کی جدت بھی پائی جاتی ہے۔

اُن عورتوں میں زیادہ حصہ تو ان کا ہے جو سودا سلف لینے کے لیے بازار میں آتی ہیں۔ ان کے بعد ان کا بڑا بڑا جو کار خانوں یا اپنے آقوں اور دفاتروں میں کام کرنے جاتی ہیں بعض جگہ وہ کم سن لڑکیاں دکھائی دین گی جو اسکولوں کو جا رہی ہیں۔ اور بعض جگہ وہ خادائیں نظر آئیں گی جو صاف اور براق ایرون یعنی وہ کپڑا جو لباس کے صاف رکھنے کے لیے کرین لپیٹ لیا جاتا ہے۔ اندھ کسی دکان کی طرف دوڑی جاتی ہیں۔ اور انھیں کے غول میں ایک آدھا ایسی لڑکی بھی نظر سے گزر جائے گی۔ جو نیڈلن یا اور کوئی باجہ ہاتھ میں لٹکاے اپنے موسیقی کے استاد کی طرف چلی جا رہی ہے۔ انھیں عورتوں کے غول میں آپ کو بعض وہ نو عمر سیاں بی بی یا سنگتر بھی ملین گے جو بی بی یا مسعودہ کا ہاتھ ہاتھ میں لے کے ٹیلے کو نکلتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کی باتوں میں مشغول نہایت ہی اہستگی سے قدم اٹھائے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ اور آخر میں آپ افسوس کے ساتھ کبھی کسی جگہ اس عورت کو بھی پائیں گے جو ٹرکوں پر اپنی قسمت ڈھونڈھنے کو نکلی ہے۔ بعینہ اسی طرح جس طرح کہ آپ اپنی ٹرکوں پر ہر مذاق ہر خیال اور ہر قسم کے چال چلن کے مردوں کو دیکھتے ہیں اسی طرح آپ وہاں کی ٹرکوں پر ہر قسم ہر مذاق کی عورتوں کو دیکھیں گے اور اس کے ساتھ آپ کو اپنے خیال اور اپنے مسلمات کے خلاف یہی نظر آئے گا کہ جس طرح آپ کی ٹرکوں پر ہر قسم اور ہر وضع کے لوگ مل جمل جانے کے بعد پھر بھی اپنی اپنی وضع پر قائم رہتے ہیں اور ایک کا دوسرے پر اثر نہیں پڑتا۔ یعنی شریف شریف ہی باقی رہتے ہیں اور باجی باجی ہی اسی طرح وہاں کی عورتیں باوجود اس کے کہ سب ایک ہی ٹرک پر گزرتی ہیں۔ مگر جو جس وضع اور رفتار کی ہیں اپنی اپنی وضع اور رفتار پر قائم رہتی ہیں۔

لندن کی ٹرک کی ایک اجمالی تصویر دکھا دینے کے بعد اب مجھے ضرورت معلوم ہوئی ہے کہ عورتوں کے اصلی اور تفصیلی حالات سے آپ کو مطلع کروں۔ جس کے لیے مناسب ہے کہ سب کے پہلے میں یہ بتا دوں کہ ایک لڑکی کی زندگی ابتدا سے انتہا تک کس وضع کس حالت اور کن اصول پر گزرتی ہے۔ یہیں ہی سے وہاں کی لڑکیوں کی زندگی آپ کی لڑکیوں سے بالکل بدلی ہوئی ہوتی ہے۔ آپ کو شاید یہ سن کے تعجب ہو گا کہ وہاں حسن و عشق کی جذبات آپ کے مذاق کے خلاف جائز ہی نہیں۔ انسانی

زندگی کے لیے ضروری و لازمی تصور کیے جاتے ہیں۔ اور جان تک میں خیال کرتا ہوں وہاں ہر قسم کی تعلیم سے پہلے ہی لڑکوں اور لڑکیوں پر عاشق اور معشوق بننے کی تعلیم شروع ہو جاتی ہے۔ اسی وقت سے سکھا دیا جاتا ہے کہ لڑکا اگر لڑکی پر عاشق ہو تو کن الفاظ اور کن اشارات و حرکات سے اظہار عشق کرے۔ اور لڑکی کو بھی بنا دیا جاتا ہے کہ اگر اس پر کوئی اظہار عشق کرے تو وہ کیا کرے۔ اور کیونکر پیش آئے۔ اسی قدر نہیں اور اس کو خضعت اس بات کی بھی تعلیم شروع ہو جاتی ہے کہ وہ کسی لڑکے کو اپنے دامن محبت میں گرفتار کرنا چاہتے تو کن اداؤں سے کام لے اور وہ کون کون سے حرکات ہیں جو مرد کے جذبات عشق کو حرکت میں لاسکتی ہیں۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ آپ کے بیان اور میں خیال کرتا ہوں کہ تمام ان حاکم میں جن پر اسلامی معاشرت کا اثر پڑا ہوا ہے اس قسم کے امور بالکل خود رد ہوتے ہیں اور مرد عورت کو محض فطرت کی تعلیم سے حاصل ہوتے ہیں اور وہاں اس کے خلاف ان امور میں بھی انسانی کاریگری اور آرٹ کو بہت کچھ دخل ہو گیا ہے۔

انگلستان کی اس ابتدائی تعلیم کو میں کسی کے کہنے سننے یا روایت کی بنا پر نہیں بیان کرتا ہوں بلکہ میں کہہ سکتا ہوں کہ ان تمام باتوں کو میں نے خود اپنے ذاتی تجربہ سے اخذ کیا ہے۔ میں جس محلہ میں رہتا تھا اور جن لوگوں سے ملتا جلتا تھا ان میں سے اکثر لوگ اگرچہ وہاں کے رہنے والے تھے جن کی عورتیں عموماً انگریزی قوم کے مذاق میں شہر والوں سے زیادہ باعصمت اور پاک دامن خیال کی جاتی تھیں۔ مگر انھیں کے بچوں کی اس تعلیم کو خود اپنی آنکھ سے دیکھا کرتا تھا۔ خود وہ پاکدامن عورت جس کی پاکدامنی اور عصمت شعاری کا نقش کبھی میرے دل سے نہ مٹے گا۔ یعنی وہ عورت جس کے گھر میں مجھے ایک سال سے زیادہ زمانہ تک رہنے کا اتفاق ہوا۔ اس کے دو چھوٹے بچے فرینکی اور جرجر لڈو بخوبی صورت بچہ تھے اور بہت پیاری پیاری باتیں کرتے تھے۔ ایک کی عمر چھ برس کی اور ایک کی چار سال کی تھی۔ یہ دونوں بچے پڑوس کی دو لڑکیوں پر عاشق تھے۔ ان لڑکیوں کو جن کی عمر میں بھی تین چار سال سے زیادہ نہ تھیں اپنے گھر میں لاتے اور کہتے کہ یہ ہماری سویٹ ہارٹ یعنی معشوقہ ہیں۔ یہ بچہ آپس میں بوسہ لیتے اور لڑکیاں اُسی ناز سے اور اسی طرح انکار کے بعد بوسہ دیتیں۔

جس طرح کہ کوئی جوان اور بالغ لڑکی کرے گی۔ ان باتوں پر بوڑھے ہنستے تھے۔ اور خوش ہوتے تھے۔ میں نے کبھی کبھی یہ بھی دیکھا کہ لڑکوں کی ان خود اپنے بچوں سے کتنی کہ اپنی سیوا ہارٹوں کو بلا لائے۔ وہ لڑکیاں آتیں۔ اور ہم ان کی اس معصومانہ محبت کے کھیل کو دیکھ کر خوش ہوتے۔

اسی طرح ایک مقام پر مجھے پندرہ روز تک ایک ایسی محبت میں رہنے کا اتفاق ہوا جہاں دس بارہ مرد اور آٹھ دس عورتیں ساتھ ہی رہتی تھیں۔ کھانا پینا ساتھ تھا۔ دن کو بھی اکثر صحبت رہا کرتی۔ اس محبت میں ایک چھوٹی پانچ چھ برس کی لڑکی تھی جو کئی کے نام سے پکاری جاتی تھی۔ ایک دن میں یہ لڑکی ایک بوڑھے شخص کے پاس کرسی پر بیٹھ گئی جن کی بی بی ان کے دوسرے ہاتھ پر تھیں۔ یہ بوڑھے بزرگ ایک فوجی کیپٹن تھے۔ لڑکی کی ان نے چلا کے اپنی لڑکی سے کہا، کئی دیکھو تم کو کسی ایسے شخص کے پاس بیٹھنا چاہیے جو جوان اور کنوارا ہو۔ کیپٹن..... بجا ہونے آدمی ہیں تم نہیں دیکھتیں ان کی بی بی دوسری طرف بیٹھی ہوئی ہیں، اس واقعہ سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ خود ان ہی کی گود سے ان باتوں کی تعلیم شروع ہو جاتی ہے۔ علاوہ ان میں اسی مکان میں ایک لڑکا تھا۔ ہر ریٹ۔ جس کی عمر شاید دس برس کی ہو۔ یہ لڑکا دن رات اسی لڑکی کی پر عشق ظاہر کرتا۔ دونوں رات کو بچھنے پر جاتے وقت ایک دوسرے کا بوسہ لے کے جدا ہوتے۔ اور صبح کو ملنے ہی بوسہ لیتے۔ مگر لڑکی اور لڑکا دونوں کے والدین ان باتوں کو جائز بلکہ ضروری سمجھتے ہوئے تھے۔ مزاحم ہونا درکنار بلکہ ایسے موقع دیتے رہتے تھے کہ ان دونوں معصوم عاشقوں کو اظہارِ ذوق و سوسن کی جرات ہو۔ جان تک میں نے اندازہ کیا میں سمجھتا ہوں کہ ایسی باتوں اور اس قسم کی تعلیم کی دہان ضرورت بھی ہے۔ رہا ان کی سوسائٹی میں مرد اور عورت دونوں کے لیے زندگی کا سب سے پہلا اور اہم مرحلہ ہی ہے کہ لڑکا کسی لڑکی کے دل کو جیت لے اور لڑکی اپنے لیے کوئی جانا بنا عاشق پیدا کر لے۔

علاوہ ان میں سوسائٹی میں جب مرد اور عورت ملتے ہیں تو وہاں سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ مرد اور عورت دونوں بیباکی سے اور بغیر اس کو کہ لجا میں اور شراب میں ہر قسم کے خیال کو جو ان کے مذاق میں نقش نہ ہو بلکہ

اور جرأت کے ساتھ ادا کر جائیں۔ جس لڑکے اور لڑکی میں یہ بات نہیں ہے۔ وہ دراصل وہاں کی محبت میں ملنے اور شریک ہونے کے قابل ہی نہیں ہیں۔ آپ کے ہندوستانی لڑکے جو وہاں جاتے ہیں چونکہ بچپن سے ان کے مذاق میں ایک شرم پیدا رہتی ہے لہذا وہاں کی سوسائٹی کے قابل کبھی نہیں ہو سکتے۔ جو نایہ لڑکے اور شرم کے غلبہ میں رہتے ہیں۔ اور مشکل اسکی بھی جرأت کر سکتے ہیں کہ وہاں کی عورتوں میں نہ کم سکین۔ بخلاف اس کے انگلش لڑکے اور لڑکیاں بچپن ہی میں اس قدر مبیاک اور جبری ہوتے ہیں جتنے کہ آپ بڑھاپے میں بھی نہیں ہو سکتے۔ انگریزوں کی چھوٹی بچی سے بھی آپ اس کی شادی کے متعلق کچھ پوچھتے تو وہ نہایت مبیاکی اور منافات سے جواب دے گی۔ اور اس کے چہرے پر نام کو بھی لجا ہٹ نہ ہو گی۔ بخلاف اس کے اگر آپ اپنے جوان بیٹوں سے بھی ایسا ہی کوئی سوال کیجئے تو وہ شرم کے سر جھکا لیں گے۔ اصل یہ ہے کہ اس ملک کے مذاق میں یہ شرم عیب سمجھی جاتی ہے۔ اور آپ کے مذاق میں ایک حد تک ہنر لیکن اس عشق اور محبت کے تعلیم کے ساتھ ان کی عفت کا بھی بہت کچھ خیال رکھا جاتا ہے۔ آپ کو یہ سن کے حیرت ہو جائیگی اور شاید مشکل یقین آئے گا کہ باوجود ان تمام باتوں کے جن کو آپ اپنے مذاق میں اتنا درجہ کی بے عفتی خیال کرتے ہیں۔ وہاں کی لڑکیاں کثرت سے ایسی پاک دہن رہتی ہیں کہ سن بلوغ تک پونچھنے بلکہ اس کے بعد بھی دو چار برس گزر جائے تب تک اس سے بھی نہیں واقف ہوئیں کہ مرد اور عورت میں اصلی فرق کیا ہے۔ اور مرد کیوں مرد۔ اور عورت کیوں عورت ہے۔ حقیقت میں یہ ایک ایسی بات ہے کہ اکثر ہندوستانیوں کی سمجھ سے باہر ہے مگر اس کی زیادہ تر وجہ یہ ہے کہ وہاں عوام اور بازاریوں تک کی زبان سے کبھی خفش الفاظ اور ایسی غلیظ گافیاں نہیں سنی جاتیں جیسی کہ بیان ہر مرتبہ مگر سے باہر نکلتے ہی آپ سن لیا کرتے ہیں۔ ہمارے بچے بچپن ہی میں ان ناپاک الفاظ کو سڑکوں پر سنتے ہیں۔ اور اپنے دل ہی دل میں ان کے معنی سمجھنے کے متحسّس ہوتے ہیں۔ اور آخر اسکول و دستوں یا خدمتگاروں میں سے کوئی ایسا بھی مل جاتا ہے جو ان معاملات کو خوب حل کر کے بتا دیتا ہے اور محبت کے جذبات پیدا ہونے سے پہلے ان کو یہ ناپاک باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ اور شاید

یہ اسی کا نتیجہ ہے جو مجھے انگلستان میں نظر آیا کہ بدکاری وہاں میں رسیدہ لوگوں بلکہ بڑھوں میں زیادہ ہے اور یہاں تو عمر دن میں اور بعض تجربات مجھے ایسے حاصل ہوئے ہیں جن کی بنا پر میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ یہاں کے نابالغوں میں بھی

الغرض اسی قسم کی گھریلو تعلیموں اور اسی طرح محبت کے کھیلوں میں لڑکیاں اس عمر کو پہنچ جاتی ہیں کہ اسکول بھیجی جائیں۔ اگرچہ لڑکیوں کے مدارس میں بقول ہمارے قیدر آبادی دوستوں کے ننھے ننھے مرد بچہ بھی لے لیے جاتے ہیں۔ مگر حقیقت میں وہاں تو لڑکوں اور لڑکیوں کے مدارس جدا جدا ہیں۔ لڑکوں کے مدارس الگ ہیں اور لڑکیوں کے مدارس الگ۔ اس موقع پر مجھے اتنا کہہ دینا چاہیے کہ امریکہ والوں کو اس بارہ خاص میں اہل انگلینڈ سے اختلاف ہے۔ ان کے وہاں لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے مدارس کی کوئی تفریق نہیں۔ اور جب دونوں میں بدکاری پیدا ہونے کا اندیشہ ظاہر کر کے اس تفریق کی ضرورت بتائی جاتی ہے تو امریکی الے کہتے ہیں کہ یہ اندیشہ بالکل بیجا ہے۔ اور وہ محبت بھی زیادہ سچی پائندارادہ قابل قدر ہوگی۔ جس کو لڑکے اور لڑکیاں اسکول سے لے کے باہر آئیں۔ تاہم انگلستان والے اب تک مدارس کی جدارہ کھنے کی ضرورت کو مانے جاتے ہیں۔ اور آج تک یہ تفریق قائم ہے۔

اب مجھے یہ بتانا چاہیے کہ لڑکیوں کو وہاں تعلیم کن چیزوں کی دلائی جاتی ہے۔ اور اسی کے ذیل میں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ وہاں کی سوسائٹی میں عورت کو کن کن چیزوں کی ضرورت ہے۔ اور انسانی معاشرت میں عورت کیا پارٹ لیتی ہے۔ جن جن علموں اور فنون کی تعلیم میں بتانا ہوں یہ صرف موجودہ سلسلہ تعلیم کی بنا پر ہے۔ مگر چند سال سے عورتوں میں اس قدر تبدیلی ہو گئی ہے کہ میرے خیال میں بہت جلد یہ کورس بدلا چاہتا ہے۔ اس لیے کہ روز بروز عورتیں اپنے زیادہ حقوق اور دنیاوی اغراض میں اپنی زیادہ ضرورتیں ثابت کرتی جاتی ہیں۔ اس وقت تک عام طور سے لڑکیوں کو ابتدائی مدارس میں پڑھنے لکھنے سیکھنے پڑوانے کا ارہٹہ لکھانے پکانے۔ تصویر کھینچنے۔ گانے۔ ناچنے۔ اور پیاؤ بجانے کی تعلیم دلائی جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ بعض قسم کی رزٹین بھی تعلیم کے ساتھ ضروری سمجھی

جاتی ہیں۔ ابتدائی تعلیم جس طرح لڑکوں کے لیے جبریہ ہے۔ اسی طرح لڑکیوں کے لیے بھی ہے۔ جو ان بچوں کے بارے میں اسکول میں نہ بھیجیں تو اسکول کی درس کی رپورٹ پر یا کسی اور کی شہر سانی پر ان کو جرمانہ وغیرہ کی سزا ہو جاتی ہے۔ ان مدارس میں تعلیم پانے کے بعد پھر لڑکیوں کو اختیار ہے کہ جس علم و فن کی طرف چاہیں تو جہ کریں۔ اور ہر قسم کی اعلیٰ تعلیم کا ہن خاص لڑکیوں کے لیے موجود ہیں۔ وہ کالجوں میں جا کے آتی۔ آئے۔ اور ایم۔ آے۔ کی ڈگری پاس کر سکتی ہیں۔ ڈاکٹری کا اعلیٰ درجہ کا امتحان دے سکتی ہیں۔ یا معمری درجہ تک اصول حفظ صحت اور طریقہ تیمارداری کو سیکھ کے نرس بن سکتی ہیں۔ یا بعض ڈیپارٹمنٹل امتحان پاس کر کے سرکاری خدمات حاصل کر سکتی ہیں۔ اس وقت تک جو کہ مرد و بان عورتوں کو دیا جا رہا ہے ہیں۔ اور عورتوں میں اس قسم کی ایک جس پیدا ہو گئی ہے کہ وہ دبائی جاتی ہیں۔ لہذا طلب علم میں وہ لڑکوں اور مردوں سے زیادہ گرم جوشی دکھانے لگی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگرچہ اس وقت تک طلبہ میں زیادہ شمار مردوں ہی کا ہے مگر وہ تھوڑی لڑکیاں بھی اس ذوق و شوق سے پڑھتی اور تعلیم پاتی ہیں کہ اکثر لڑکوں سے زیادہ مہر پا جاتی ہیں صرف یہی نہیں جن محکمات میں عورتوں کو ملازمت دی جانے لگی ہے۔ ان میں عورتیں صرف اپنی لیاقت کا ثبوت دینے اور حقون قائم کرنے کے لیے ایسی اچانکاری اور جفاکشی سے کام کرتی ہیں کہ عموماً رپورٹیں عورتوں کی فیویر اور طرفداری میں ہوتی ہیں۔ ڈاک خانہ اور تار برقی کے محکمہ میں زیادہ تر عورتوں کو جگہیں مل گئی ہیں۔ ان محکموں کی سالانہ رپورٹوں سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جو دفتر عورتوں کے ہاتھ میں تھے ان میں بمقابلہ ان دفاتر کے جو مردوں کے ہاتھ میں تھے۔ راست بازی اور محنت سے کام ہوا اور زیادہ کام ہوا۔ اور دلچسپی سے کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ پھرتی اور چالاک اگرچہ وہ ان ہر شخص کی طبیعت و خیر میں ہے۔ مگر جیسی پھرتی اور چالاک عورتوں کی رفتار و عادات سے ظاہر ہوتی ہے وہ مردوں سے بدرجہا زیادہ ہے۔ عورتوں اور مردوں میں جو کہ ایک کمیشن یعنی مقابلہ شروع ہو گیا ہے۔ لہذا نوع انسان کی ان فطرتی خصوصیات

میں باہمی تعصب شروع ہو گیا ہے۔ جو مرد بہ در بڑھتا جاتا ہے۔ جس کا ثبوت وہاں کے اُن اخباروں اور رسالوں سے ہو سکتا ہے۔ جو سوسائٹی سپر کلماٹے ہیں۔ ان میں بہت سے رسالے مردوں کے ہاتھ میں ہیں۔ اور بہت سے عورتوں کے ہاتھ میں۔ اور دونوں ایک دوسرے پر طعن و تشنیع کرتے رہتے ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اس بارہ خاص میں بھی عورتوں کی رفتار بمقابلہ مردوں کے نہایت متانت اور سنجیدگی کے ساتھ ہے جس سے کامیابی کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ اس لیے کہ وہ اخبار جو مردوں کے وکیل ہیں ہمیشہ عورتوں پر طعن و تشنیع کرتے ہیں۔ بخلاف اس کے عورتوں کے اخبار زیادہ تر عورتوں کو ترغیب دے کر آواز دہرائیں اور ان کو ترقی کے راستہ بتاتے ہیں مشغول رہتے ہیں۔ اور بہت کم جواب دینے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

یہ تفریق وہاں مدت سے قائم ہو گئی ہے کہ بوجھ اٹھانے اور سخت جسمانی محنت کے کاموں کو عورتیں ہاتھ نہیں لگاتی ہیں۔ وہ زیادہ تر انھیں کاموں کو اپنے ہاتھ میں لیتی ہیں جن میں زیادہ تر دکھانا مقصود خاطر ہو۔ بخلاف اس کے تمام وہ کام جن کو سخت جسمانی محنت سے تعلق ہے سب مردوں کے ہاتھ میں ہیں۔ آپ کے بیان میں بالکل اس کا اُٹھا دکھتا ہوں اس لیے کہ بیان کی عورتیں عام پر تو معطل ہی کر دی گئی ہیں اور جو چند کام کرتی ہیں تو ایسے سخت کاموں سے بھی مشکل ہو سکیں بعض ڈبلی اور ناتوان عورتوں کو دو دو تین تین من کا بوجھ بیٹھ پر اٹھانے ہوئے بیان کی سڑکوں پر جاتے دیکھ کے یقین ہے کہ میری طرح آپ کو بھی اکثر افسوس ہوا ہو گا۔ وہاں بالکل ایسا نہیں ہے۔ اول تو وہاں ہاتھ سے پھیلنے اور پاؤں سے چلانے کی گاڑیاں اس کثرت سے پھیل گئی ہیں کہ کوئی مرد بھی بوجھ اٹھانے ہوئے نہیں نظر آتا۔ لیکن اسٹیشنوں اور بندر گاہوں پر اس قسم کے کاموں کی تھوڑی بہت ضرورت باقی ہی رہ گئی ہے تو عموماً مردوں کے ہاتھ سے اجرا پاتی ہے۔ اس کے مقابل میں عام قسم کے جو کام عورتوں کے ہاتھ سے اجرا پاتے ہیں وہ یہ ہیں کہ خدمتگاری کا کام عموماً عورتیں کرتی ہیں۔ دوکاندار ہی میں گاہکوں سے ملنا اور چیزوں کو بیچنا عام طور پر عورتوں کا کام ہے۔ چار خانوں اور عام قسم کے ہوٹلوں میں کل کام عورتوں ہی کے ہاتھ سے

اجرا پاتے ہیں شراب پلائیوالبان سب عورتیں ہیں بڑے بڑے کارخانہ نوں میں جو کام تھوڑی محنت سے اور جلد کرنے کے یا ایک جگہ بیٹھ کے کرنے کے اور نیز وہ کام جن کو صفائی اور ستھرے پن سے تعلق ہے سب عورتوں کے ہاتھ میں ہیں۔ یہ کام پہلے عموماً مردوں کے ہاتھ میں تھے۔ مگر تدریجاً سب جگہ سے مرد نکل گئے اور عورتیں اُن کی قائم مقام ہو گئیں۔ اس کی زیادہ وجہ اول تو یہ ہے کہ جن کاموں میں بھرتی اور چالاک کی کو دخل ہوتا ہے۔ اُن میں اکثر عورتیں مردوں سے غالب رہتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ اُن کے مزاج میں صفائی مردوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ ہر چیز کو صاف رکھنا جیسا عورتیں جانتی ہیں مرد نہیں جانتے۔ اور تیسرا اور سب سے قوی سبب یہ ہے کہ مردوں کے مقابلہ میں عورتیں بہت کم تنخواہ پر رہتی ہیں کارخانہ داروں کو جتنی کفایت عورتوں کے رکھنے میں پڑتی ہے۔ اتنی مردوں کے نوکر رکھنے میں نہیں بڑھ سکتی۔ اس کے اسباب پر بھی میں نے بہت غور کیا۔ اور آخر غور کرتے کرتے اور وہاں کی لائف کا تجربہ اٹھانے اٹھانے اصل وجہ کا پتہ لگ گیا۔ بات یہ ہے کہ مردوں کے عموماً اپنے ساتھ بی بی بچوں کا بھی بار ہوتا ہے۔ اور عورتیں جو کام کر رہی ہیں عموماً کنواری رہیں ہوتی ہیں۔ ان کو سوا اپنی ذات کے اور کسی کی فکر نہیں ہوتی بیان مشہور ہے کہ گلستان میں مرد کم شادی کرتے ہیں۔ اعلیٰ اور درمیانی طبقہ میں ایک حد تک میں اس کو مان لوں گا۔ مگر عام لوگوں کا حال بالکل اس کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ بہت کم ایسے مرد ہوتے ہیں جن کی شادی نہ ہوئی ہو۔ قطع نظر اس کے وہاں اور شاید بیان بھی یہ عام قاعدہ ہے کہ مرد جو شادی نہیں کرتے ان میں سے زیادہ اکثر ایسے ہوتے ہیں جو کسی عورت سے ناجائز تعلق رکھتے ہوتے ہیں اُن کے سر جائز بی بی سے زیادہ اور بدرجہا زیادہ بار ایک ناجائز معشوقہ کا ہوتا ہے۔ بخلاف عورتوں کے کہ جتنی کنواری ہیں ان میں سے کثرت بلکہ قریب قریب کل ایسی ہوتی ہیں کہ حقیقت میں کنواری ہوتی ہیں۔ اور سو میں چار پانچ اگر آوارہ بھی ہوتی ہیں تو بچے اس کے کہ مرد کو کچھ دین تھوڑا بہت اس سے اور وصول کر لیا کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں اگر کسی عورت کے حرام سے بچہ بھی ہو جائے تو وہاں کا قانون بچہ کے پرورش کے مصارف

اسی شخص سے دلوانا ہے جس کا نطفہ ہو جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر کسی عورت کے کوئی بچہ ہو تو بھی وہ اس کی پرورش کے بارے سے سبکدوش رہتی ہے۔

ان تمام کاموں کے بالاستقلال اپنے ہاتھ میں لے لینے سے اگر عورتوں کو کوئی چیز روک سکتی تھی تو وہ وضع حمل اور ایام رضاعت کا زمانہ تھا اس کی جتنا ہی معقول تدبیر ہو گئی ہے کہ اولاً تو جب سے سوس ملک جس کو آپ اپنی اصطلاح میں ڈبلے کا دو دھ کہتے ہیں جاری ہوا۔ وہ ان کے امیر و غریب اور قریب و قریب ساری عورتوں نے دو دھ پلانا چھوڑ دیا۔ صرت بچہ کا گو دھ میں لیے رہنا رہ گیا تھا اس کا بون انتظام کر دیا گیا کہ اس قسم کے خاص خاص مکانات اکثر محلوں میں جاری کر دیے گئے ہیں۔ جن میں بچوں کے پالنے کے لیے دایمان نوکر ہیں۔ اور جو عورت اپنا بچہ اور اُس کے ساتھ چھ پنس جو آپ کے آٹھ آنے کے برابر ہوتا ہے دے دیتے جاتے اس کا لڑکا صبح سے شام تک پوری نگرانی کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔ اور دن بھر اُس کو جو دو دھ پلایا جاتا ہے اُس کی قیمت بھی انھیں چھ پنس میں شامل ہے۔ ان مکانات کے جاری ہونے سے یہ آسانی ہو گئی ہے کہ ہر عورت ایک ہفتہ کی رخصت لے کر وضع حمل سے فراغت کر لیتی ہے۔ اور اُس کے بعد سے روزانہ کارخانہ جاتے وقت اپنا بچہ انھیں مکانون میں دایمان کے حوالے کر دیتی ہے۔ اور شام کو گھر آتے وقت لے لیتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان عام لوگوں کا تذکرہ بیان کرتے کرتے میں صلی تعلیم کے بجٹ سے بہت دور جا پڑا۔ یہ اوپر بیان کر چکا کہ عموماً تعلیم کن چیزوں کی دلائی جاتی ہے۔ اور ابتدائی تعلیم کے بعد جو انسانی ضرورت کے لیے لازمی سمجھی گئی ہے۔ عورتیں کن کن سمجھکوں میں ترقی کر سکتی ہیں۔ اور ہر امر میں ترقی کا دروازہ ان کے لیے کھلا ہوا ہے مگر چونکہ پہلے سے اس قدر ترقی کر چکے تھے کہ پڑھا لکھا آدمی ہر کام اور ہر شے کو کرتا اور کر سکتا تھا لہذا ہندوستان کے مردوں کی طرح وہ ان عورتوں کی تعلیم نے یہ خرابی نہیں پیدا کی کہ ہر پڑھا لکھا آدمی اسکول سے نکلے ہی تعلیم اور نوکری کی طرف متوجہ ہو جائے اور اپنے قدیم پیشہ کو چھوڑ دیے۔ شاید یہ دشواری وہ ان کے مردوں میں تعلیم کے رواج پر یہ ہونیکے وقت پیش آئی ہو۔ لیکن عورتوں نے تعلیم لے کے کبھی کسی کام کے کرنے سے شرم اور عاجزی ظاہر نہیں کی۔ وہ بڑھنے کے بعد بھی اپنے انھیں کاموں کو کرتی رہیں

جن کو پہلے کرتی تھیں۔ اور جب انھوں نے خود کمانے اور اپنے توت بازو سے روپیہ پیدا کرنے کی طرف توجہ کی تو ہر کام اور ہر پیشہ کو جو عورت کے مناسب ہو سکتا ہو اختیار کر لیا۔ اور جو خانہ داری کے کام پہلے سے کر رہی تھیں ان کو زیادہ ایاق و دانائی سے کرنے لگیں۔

وہ علمی مذاق اور دماغی کام جن کو دنیا کی تمام گزشتہ عمر میں مردوں نے اپنے ساتھ مخصوص رکھا تھا اور عورتوں کو یہاں تک اُن کاموں سے علیحدہ کر دیا تھا کہ عورتوں کی جمالت اور کم فہمی صرف آپ ہی کے بیان میں تو رہا اور خالص گلہ بے بین بھی ضرب المثل ہو گئی تھی عورتوں نے صرف اپنی کوشش اور بے انتہائی ترقی سے غلط اور بے اصل ثابت کر دیا۔ آج آپ وہاں جاکے دیکھیے تو صاف نظر آتا ہے کہ علمی ذوق اور دماغی انوکھی خیالی میں عورتیں کسی درجہ مردوں سے کم نہیں ہیں آپ وہاں دنگل اور گھنٹے پڑھنے کے کاموں میں عورتوں کو اسی کر سہی پڑھا رہیں گے جس پر آپ نے سوا سہ مرد کے کبھی عورت کو دیکھا ہی نہیں۔ برٹش میوزیم کا کتب خانہ جو صرف عالی دماغ مصنفوں کے لیے کھولا گیا ہے۔ وہاں مردوں کے برابر ہی آپ عورتوں کو بھی سلاخ کتب میں مشغول اور تھکا پامین گے۔ اور میں تعجب اور حیرت کے ساتھ دیکھتا تھا کہ وہ کتابیں فرض دینے والی لبریریاں جن کی شاخیں انگلستان کے ہر چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں بھی کھلی ہوئی ہیں اُن سے زیادہ فائدہ اٹھانے والی عورتیں ہی تھیں تصنیف و تالیف کا سلسلہ عورتوں نے بھی جاری کر دیا اور اُن کی جذبہ ہی رد کی توجہ کا نتیجہ ظاہر ہو گیا کہ عام خیال قائم ہو گیا ہے کہ عورتیں مردوں سے ابھی ناولسٹ ہوتی ہیں۔ اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیے۔ اس لیے کہ ناول نگاری کا دار و مدار ایک تو زبان پر ہے اور دوسرے اُن باتوں میں بصیرت ہونے پر جن کو خانہ داری اور معاشرت سے تعلق ہے اور ان دونوں میں عورت فطرۃً مرد سے ابھی ہوتی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کی عورتیں ناول نگاری میں منفرد مردوں کو شکست اور فاش شکست دیا جاتی ہیں۔ صدائے عورتیں ایسی ہیں جو مصنفوں نگاری اور اخباروں کی ایڈیٹری پر زندگی بسر کر رہی ہیں۔



(از جناب لطافت حسین صاحب)

نسل آریہ باشندے۔ تمدن اور طرز معاشرت
سرزمین ایران کی سب سے مشہور اور نادر شے اس کے باشندے
ہیں جو آریہ نسل سے ہیں۔ دندیدادین لکھا ہے کہ ان کا اصلی وطن آذربائیجان یا شاید
شمالی ترکستان میں ایک مقام آریایانا دیا گیا تھا۔ شدت سرا یا دیگر وجہ سے مجبور ہو کر
حضرت مسیح علیہ السلام سے دو ہزار برس پہلے اس قوم نے وہاں سے ہجرت کرنا شروع
کی اور رفتہ رفتہ ایران کے کل حصوں میں پھیل گئی۔

آریوں کے بعض قبیلے مشرق کی جانب روانہ ہوئے۔ اور غالباً افغانستان
میں پہنچ کر ان کے دو حصے ہو گئے۔ ایک کوہ ہندوکش کو پار کر کے پنجاب میں آ بسا
اور دوسرا باختر ہو چکا جہاں کیانی سلطنت کی بنیاد پڑی اور وہیں علم تمدن کا پہلا
مرکز قائم ہوا۔

دیکر قبائل بلوچستان۔ ثم وادریخ کے اطراف میں منتشر ہو گئے بعضوں
نے ایشیائے کوچک کا رخ کیا۔ اور بعض مغربی و شمالی ایران یا میدیہ (مید) میں
جا کر آباد ہوئے۔ اور آئندہ چل کر ایک سلطنت کے بانی ہوئے۔ جس کی مغربی سرحد
لک آلم سے ملتی تھی۔ اور اسی لیے آخر الذکر کے تمدن کا ان پر بہت زیادہ اثر
پڑا۔ آریہ نسل کا ایک حصہ صوبہ فارس میں بھی جا بسا۔ جس سے آئندہ خاندان

ہخامنشی کا آغاز ہوا۔ ہجرت اور نوآبادیان قائم کرنے کا یہ تمام زمانہ جس کا اندازہ اور تاریخ معلوم کرنا ناممکن ہے اغلب یہ ہے کہ کئی صدیوں تک جاری رہا ہو گا۔

تقسیم و فرقہ بندی شروع زمانے میں سب آریہ چرواہے تھے۔ ان کے مختلف

قبیلے تھے۔ ہر قبیلے میں ایک کھیا یا سردار ہوتا تھا جس سے اہل خاندان وابستہ تھے۔ اور وہی اُن کی حفاظت اور باہمی نزاع وغیرہ کے تصفیہ کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ کورش کے زمانے کی ہی طرز معاشرت تھی بلکہ آجکل بھی ایران کی تختیاری قوم اسی اصول پر کاربند ہے۔ شاہنامے میں منقول ہے کہ سب سے پہلا شخص جس نے ایران میں فرقہ بندی کی وہ جمشید تھا۔ اُس نے چار تقسیمیں کیں یعنی پڑھت۔ سیاہی۔ کسان۔ اور اہل حرفہ۔ مگر کتاب بندھش (دستاویز) میں لکھا ہے کہ یہ اصلاح زرشت کے زمانے میں ہوئی۔ زرشت کے تین لڑکے تھے۔ پہلا رئیس روحانیان ہوا۔ دوسرا جہان پهلوان اور تیسرا سردار دھقان۔ زمانہ مابعد میں جب غیر آریہ اقوام یعنی تورانیوں سے زیادہ سابقہ بڑے لگاؤ مفتوحہ قوم کا ایک نیا طبقہ قائم ہوا اور اُن میں سے جنہوں نے زرشتی مذہب کو نہیں قبول کیا انھیں دیکوسن یا دیورست کہنے لگے۔ اور انھیں حد درجہ ذلیل اور قابل نفرت سمجھتے۔ ساسانیوں نے بھی تذکرہ بالا تقسیم کو قائم کیا اور اس کے علاوہ اپنی

عہ اس فرقے میں رہتھناؤن (رتھا + استا = استادہ درویشک) بھی شامل تھے۔ یہ لقب انھیں اس لیے دیا گیا کہ ایران میں سرداران بادقار یا پیادہ جنگ کو اعزاز سمجھتے تھے۔ انھیں تورانیوں اور ساسانیوں کے زمانے میں انھیں پهلوان (بمعنی دارندہ یا محافظ شہر) کہنے لگے۔ یہ فرقہ اپنی تجارت۔ شجاعت۔ قابلیت۔ اور خوش اخلاقی کے لحاظ سے محبوب عام تھا۔ زمانہ صلح میں۔ ان کا مشغلہ زمینداری نیزہ بازی اور سروسکار تھا۔ مگر لشکر کشی یا دشمنان کے حملے کے وقت یہ اپنے قبیلوں کے ساتھ فوراً میدان جنگ میں پہنچتے۔ اور شنشنا کے شریک حال ہوتے۔ شاہان کیانی بھی اسی فرقے سے تھے۔ لیکن لفظ کوئی (بمعنی عالم روحانی) اُن کے نام کے ساتھ تختی بدست سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنگجو ہونے کے علاوہ روحانی سرداری کا بھی دعویٰ رکھتے تھے۔

قوم میں ایک پانچوان طبقہ قائم کیا جسے کاتب کہتے تھے۔ اس کا کام قوانین کتبات اور احکام شاہی کو منضبط کرنا تھا۔ شاعر۔ حکیم اور غوی بھی اسی طبقے میں شامل تھے ایران میں بہ خلاف ہندوستان ذات پات کا کبھی سختی کے ساتھ لحاظ نہیں کیا گیا۔ ہر شخص بڑے عہدے پر پہنچ سکتا تھا۔ اور ہر پیشہ ور اگر کوئی خاص قابلیت رکھتا ہو تو بادشاہ کی منظوری کے بعد اُسے دوسرے طبقے میں شامل ہونے کی اجازت مل جاتی تھی۔ یعنی عسکری یا دھنقان کے لیے ہیر بد ہونا ممکن تھا۔ فرزند دستور اگر چاہتا تو کوئی دوسرا پیشہ اختیار کر سکتا تھا۔

طریقہ بود و باش عوام

اوائل زمانہ میں آریہ خاندن بدوش و شنجیار یون کی طرح ہیاڑوں اور بلند مقاموں پر جانوروں کی کھال یا بالوں کے خیموں میں رہتے تھے۔ گرمیوں میں سر کے آتے ہی وہ اپنے گلوں سمیت گرم میدانوں میں اتر آتے اور اپنا کل ساز و سامان گھڑوں اور اونٹوں پر لاد دے ہوئے جگہ جگہ پھرتے رہتے۔ بعد ازاں جس حد تک شائستگی اور رعایت آتی گئی مکانات بنائے گئے۔ بیتان اور شہر قائم ہوئے۔ اور صنعت و حرفت کو ترقی ہوئی۔ محلات شاہی کے علاوہ جن کے آثار موجود ہیں صحیح طور پر ظلم نہیں ہے کہ عوام کس طرح رہتے تھے۔ مگر گمان غالب یہ ہے کہ زیادہ تر دیہاتی زندگی تھی اکثر لوگ زراعت پیشہ تھے اہل خاندان

عہد سرباخشویت۔ یاد مقامان۔ قدیم ایران میں شبانی اور کاشتکاری شریف ترین پیشے تھے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو دین زرتشتی کی بنیاد زراعت و آبادی پر ہی یعنی کئی بھراور زمین کو اپنی کھیتی باڑی و زراعت پر بنانا آہرمن کو شکست دینا اور سربا زراعت سمجھا جاتا تھا۔ یاد میں ایک جگہ مذکور ہے۔ جب آہرمن کشت و جو سے سبز ہوئی تو آہرمن چلا تا ہوا بہر آتا ہے۔ جب جو خرمن سے جدا ہوتا ہے۔ آہرمن روتا ہے۔

جب جو چکی میں پستنا ہے۔ آہرمن آہ کے نعرہ بلند کرتا ہے۔ جب آہرمن کرتیا رہو جاتا ہے۔ آہرمن اسے فہمیک بھوش ہو جاتا ہے۔

اس میں ظاہر ہے کہ پیشہ زراعت نہ صرف مفاد زندگی بلکہ نجات آخری کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا! اور لوگ اسے مثال میں بہت بڑے دلی انماک اور مذہبی جوش کا اظہار کرتے تھے ہر طرح کی زحمتیں گوارا کی جاتی تھیں زمین خشک ہو جائے تو آہرمن سے سربسز و شاداب کیجائی تھی۔ خاردار بنے تھے اور صحران پودے کھود کر چھنیک دیے جاتے تھے۔

سایہ فگن اور سیوہ دار در خون کی قدر کیجائی۔ اور موجودہ بیابان اُس زمانے میں چین و بوسان کی طرح سبز و لالہ زار تھے نقل ہے (اور فردوسی نے بھی اس کا ذکر کیا ہے) کہ زرتشت نے مقام کا شرمین ایک سرد کا دست

ایک ہی مکان میں رہتے سمیت تھے جس کے باہر مویشیوں کے لیے ایک صلیبہ جگہ ہوتی تھی۔ اور گتے اور قترغ بھی اس میں ضرور رہتے تھے کیونکہ وہ متبرک سمجھے جاتے تھے۔ لوگوں کی طرز معاشرت میں مذہب کا رنگ بہت زیادہ چڑھا تھا۔ ایسا کے بیشما قوانین و احکام میں درمرہ کی زندگی تمام تر جگہ ہی ہوتی تھی۔ ہر مکان میں ایک آتش گاہ

لگا ہوا تھا۔ جو المتوکل عباسی کے عہد تک موجود تھا۔ جب اُس نے اسے قطع کرنے کا حکم دیا تو ہر طرف سے زرتشتی آئے اور زردو جو اہنذر کرنے لگے مگر حاکم خلیفہ کے حکم سے مجبور تھا۔ اس نے درخت کوٹا دیا۔ اسی طرح خشیار شاہ جب فوج کشاکش غرض سے یوآن کی جانب روانہ ہوا تو اٹسا راہ میں اُسے ایک بہت بڑا سایہ دار درخت نظر آیا جسے دیکھ کر وہ اس قدر خوش ہوا کہ اسکے تنے پر سونے کا پتر لگا دیا اور اُسکی حفاظت کے لیے اپنے ایک سردار کو وہیں چھوڑ دیا۔ (ایران نامہ)

عہد نئے جو اچلی ایران میں اس قدر خشن سمجھا جاتا ہے کسی زمانے میں حدود رجم پر تھیں۔ وہ چرواہے کا خاص حامی و مددگار تھا۔ بلکہ بلا اس کے ریوڑ کی زندگی محال تھی کسی شخص کی ہمت نہ تھی کہ اُسے مارے یا ایذا پہنچائے یا اُسے کوئی اتنی گرم غذا دے کہ اُسکی جان بچ جائے۔ اُسکی نگہداشت ہر شخص پر لازم تھی۔ اُسکی عزت و حرمت فرض تھی۔ شہنشاہ اور امرا اُسے عین ثواب سمجھ کر کثرت پالنے لگے۔ مشہور ہے کہ خاتم منقش کے زمانے میں ایک ایرانی حاکم بابل نے اس کثرت سے کتے جمع کیے کہ صرف اُن کی غذا خوراک کے خرچ کے لیے کئی موصوفوں کی مالک زاری صرف ہوتی تھی۔ مذہبی کتاب میں اس جانور کی تعریف سے بھری ہوئی ہیں۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ گاہے چون شخص روحانی است در اُن مہر و جنگی دگا ہے نزل و غلام و طفل و حیوان و درندہ با سہ قناعت او چون شخص روحانی است۔ حفاظت لگے چون مرد جنگی۔ و جفا کشی ہجو کا شکار و اطاعت و انکسار و تعلق ما نند غلام و بازی چون کو دگ و در حملہ و دندان گرفتن حیوان و درندہ می شود۔

(ایران نامہ)

عہد اچھے پرورش یعنی دور بین نقب دیتے ہیں کیونکہ وہ لوگوں کو جنگم سے بچنے سے مطلع کرتا ہے۔ اُسے سرو شاہ دریزا یعنی نقیب اہن دی بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ مقدس آگ روشن کرنے کے لیے آگاہ کرتا ہے۔ اور صبح خیزی کی مستحسن عادت کی ترغیب دیتا ہے۔ مگر جو مرغ صدا سے بے ہنگام دھت اُسے منحوس سمجھ کر مار ڈالتے ہیں۔

(ایران نامہ)

مزدور تھی جس کی حفاظت مالک کے سپرد تھی۔ وہ سونے سے پہلے اُسے راکھ میں دبا دیتی۔ اور صبح ہوتے ہی مالک یا بزرگ خاندان کا فرض تھا کہ خوشبودار کرہاں ڈال کر اُسے مشتعل کرے پھر سب لوگ اس کے گرد بیٹھ کر ہر مزدور کی پرستش کرتے۔ اس کے فرشتوں سے دعائیں مانگتے خصوصاً خوشحال اور دھن دولت بخشنے والے ستھرا اور آشی کے بھیج گاتے۔ اس کے بعد اپنے روزمرہ کے کاموں کو شروع کرتے اور کھیتی باڑی یا لکڑیاں کاٹنے میں مشغول ہو جاتے۔ جنگ کے زمانے میں یہی لوگ ملک پر فدا ہونے کے لیے کمر بستہ ہوتے۔

ہر گھر میں حسب استطاعت نوکر چاکر بھی تھے جو عموماً غیر زرعتی ہوتے تھے۔ گیلان اور رازندران کے باشندے جھین اور سنا میں بہت بُرا کہا گیا ہے عموماً غلام بنا کر رکھے جاتے۔

طرز معاشرت طبقہ اعلیٰ | جون جون تمدن بڑھتا گیا زندگی کی سادگی

غائب ہونے لگی۔ زمیندار۔ جاگیردار۔ امرا۔ مزریان (صوبہ دار) وغیرہ عیش و عشرت کے ساتھ رہنے لگے۔ شاہنشاہ میں لکھا ہے کہ کیانی امرا کے بڑے بڑے محل تھے۔ اور وہ بڑی شان کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ میدیہ کا نول اور عیش و عشرت دنیا میں مشہور تھا۔ فارس نے اُس کی اتباع کی امرا نے ہتھامنش نے میدیوں ہی کے تمام عادات و اطوار سیکھے۔ بڑی عیش کے ساتھ شاندار محلوں میں رہتے تھے بکثرت غلام اور خواجہ سراؤں کی خدمت کے لیے موجود تھے۔ یونانی مؤرخوں نے میدیہ کے سرپ (دالی) کے جو حالات لکھے ہیں اُن سے معلوم ہوا ہے کہ بادشاہ کے بعد وہ بڑی شان کے ساتھ زندگی بسر کرتا تھا۔ امرا بڑے خدم و حشم کے ساتھ باہر نکلتے۔ سرکوں پر پیادہ چلنا اپنی ذلت سمجھتے۔ ادنیٰ درجے کے لوگ اُن کے سامنے آتے تو بہت جھک کر آداب بجالاتے۔ اُن سے بڑے طبقے کے لوگ رخسار پر بوسہ دیتے اور ہم رقبہ بغل گیر ہوتے۔ شرفاء عموماً اپنے ہاتھ میں ایک خوشنما پھول لیے ہوئے نکلتے اور کوئی دوست آشنا مل جاتا تو اُسے پیش کرتے تھے۔ داغے ہاتھ پر کسی کو ٹھکانا باعث عزت افزائی سمجھا جاتا۔ داہنا ہاتھ دنیا قول و قرار کی نشانی تھا۔ اور غنیمت کے قاصد کا ہاتھ اٹھائے ہوئے آنا صلح جوئی کی علامت تھی۔ امرا جب جنگ و جدل پر جاتے تو بادشاہ کی طرح اپنے حرم کو بھی ساتھ لیجاتے تھے۔

طبقہ انات

اوستا میں عورت کی تعریف کی گئی ہے۔ اُسے ذلیل نہیں سمجھا گیا ہے۔ مگر عہد سامانی میں جو مذہبی کتابیں مرتب ہوئیں اُن میں اس کی برائی لکھی ہے۔ وہ ناقص العقل ہے۔ اس کی گواہی قابل اعتبار نہیں۔ اور نہ اُس میں رازداری کی صلاحیت ہے۔ بہ خلاف اس کے کیا یون کے زمانے میں عورت کی زیادہ عزت تھی اور پردہ کا رواج عام نہ تھا۔ اس کے حقوق محفوظ تھے۔ وہ جائیداد پر قابض ہو سکتی تھی۔ گواہی دے سکتی تھی۔ شوہر کے خلاف چارہ جوئی کر سکتی تھی۔ مذہبی رسوم میں بھی شامل ہونے کی اجازت تھی حتیٰ کہ بعض موقعوں پر پردہ ہٹ کی قائم مقام بھی ہو سکتی تھی۔ روزمرہ کی زندگی میں وہ اپنے شوہر کی کھیتی باڑی میں مدد دیتی تھی۔ وہ دودھ دہتی۔ کھانا پکاتی بولیشون کی خبر گیری اور اولاد کی پرورش کرتی۔ اور گھر کا سارا انتظام بذات خود انجام دیتی مگر بعض اوقات اسے دور رکھا جاتا۔ مثلاً ایام حیض میں اُسے قریب آنے کی اجازت نہ تھی۔ اس زمانے میں کھانا بھی اُسے دور سے دے دیا جاتا۔ اور اس کی نگاہ تک منحوس سمجھی جاتی۔

پنچا منشی زمانے میں عورتوں کی پابندیاں بڑھ گئیں۔ غریبوں میں تو ایک حد تک آزادی تھی مگر اعلیٰ طبقہ کی خواتین بڑی سختی کے ساتھ پردے میں رکھی جاتیں۔ پردہ دار پالکوں میں باہر نکلتیں اور غیر مردوں سے ملنے جلنے نہ پاتی تھیں۔

عہد ساسانی میں گو پردہ ہٹا اب بھی ان کے خلاف تھے مگر یہ سختیاں کم ہو گئیں۔ پردہ زیادہ نہ رہا۔ عورتیں مروانہ کھیلوں مثلاً چوگان وغیرہ میں حصہ لینے لگیں۔ شیریں کی مثال مشہور ہے۔ اب عورتیں صاحب جائیداد اور بزرگ خاندان بن سکتی تھیں۔ اور مرد کی عدم موجودگی میں سلطنت کی مالک بھی ہو سکتی تھیں۔ چنانچہ خسرو پر وزیر کی دولہا کیان کے بعد دیگرے تخت

عہ زمانہ حیض۔ چار مہینے اور دس دن ایام حمل سے اور انہی روز بعد وضع حمل۔ ان تینوں زمانوں میں مرد عورت کے نزدیک نہ جاتا۔ اگر اس کے خلاف کرتا تو بموجب قانون مستوجب سزا سمجھا جاتا۔ (ایران نامہ)

ایران پر جلوہ گر ہوئیں۔

شادی بیاہ [شادی کے لیے مذہب میں بڑا سخت حکم تھا۔ مجرد رہنا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ کثرت ازدواج کی اجازت تھی۔ بیوہ کا نکاح نانی جائز تھا۔ غیر خاندان میں شادی کرنا زیادہ قابل اعتراض نہ تھا۔ مگر دیوبندوں سے تعلق پیدا کرنا سخت مذموم سمجھا جاتا تھا۔ عموماً سن بلوغ کے بعد ہوتی۔ والدین اُسے طے کرتے۔ مگر طرفین کی رضامندی بھی بعض اوقات حاصل کر لیتے۔ چنانچہ منشی زمانے میں کثرت ازدواج کا عام رواج تھا۔ علاوہ برین داشتہ عورتیں بھی بہت سی تھیں۔ شادی کا رسم بڑی دھوم مچا کر ادا کی جاتی تھی۔

ع ۱۵ ستامین لکھا ہے "بند ترین عمل آن است کہ یک مرد زن دوشیزہ را از گرفتن شوہر باز نشود و او را بے شوہر گذارد" و ریاضت پانزدہم میں عورتیں اور لڑکیاں انابیتا (ناہیست) اور والو (باد) سے اس طرح دعا مانگتی ہیں "عظا فرماید بایک شوہر جو ان بسیار خوش شکل کہ مارا بردش بکند و فرزندان از او پیدا کریم۔ یک شوہر فرزند امانا و فصیح نکاح کا خطبہ حسب ذیل تھا:۔ بہر درد (شما) دادا و دوس (من) کہ) میدانم۔ بیا عوزید و بداندید بواسطہ دین و این (اپنے و مادر) یک زندگی پاک منش بہ باکی شاہرود می تو نید حاصل کنید رحمت کہ گیرا۔۔۔۔۔ فصل بہار زنہ عروسی تھا نکاح و زفاف میں کچھ مدت ہوتی تھی جب دو لہن اپنے شوہر کے گھر میں آتی تو اُسے غامی یعنی خانہ بانو کہتے اور شوہر کو نالو یا سستی یعنی یعنی خانہ خداوند بہ خلاف اگر یا سہند ایران کو اگر یہ اپنے قریبی عزیز و ن میں شادی کرنا نہ چاہتا ہے چھا سمجھتے تھے جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اس زمانے میں ایران میں بہ نسبت ہندوستان (پنجاب) کے ان کی جماعتیں زیادہ پراگندہ تھیں عورتوں کی قلت تھی اور مفتوحہ یا غیر تو ام کو ذلیل سمجھ کر ان کے ساتھ ملنے جلنے سے اجتناب کرتے تھے۔ (ایران نامہ)

ارین (یونانی مورخ) لکھتا ہے کہ قدیم ایرانیوں میں شادی کے دن دولہا کو بھوکا رکھا جاتا۔ اور دولہن کے پاس جانے سے کچھ دیر پہلے چند پھل اور اونٹ کی ہڈی کا گووا کھلایا جاتا۔ جب سب مہمان دعوت اور جشن کے بعد رخصت ہو جاتے تو دولہن بن سنور کر خلوت کمرہ میں داخل ہوتی اور دولہا اپنی جگہ سے اٹھ کر استقبال کو آگے بڑھتا۔ اسے خوش آمدید کہتا اور اپنا دامن اس کے لیے بڑھاتا تھا۔

عہد ساسانی میں بھی کثرت ازدواج کا عام رواج تھا۔ مگر غربا میں اس کی زبانتی نہ تھی۔ غیر مذہب والوں میں شادی کو ناجرام سمجھا جاتا تھا۔ ہخامنش کی طرح بنیوں سے بھی نکاح ہو سکتا تھا۔ شادی کے وقت تمام مذہبی رسوم ادا کیے جاتے۔ عہد نامے پر لڑکی کے باپ اور لڑکے کے نامیدے کے باضابطہ دستخط ہوتے۔ اور لڑکی والوں کو لڑکے کے والدین سے حسب مقتدرت ردیہ ملتا۔ اس کے علاوہ اور بھی ہیت سے قاعدے اور قانون تھے۔ کسی عورت کا شوہر اپنا مذہب بدل دیتا تو سال بھر انتظار کرنے کے بعد وہ دوسری شادی کر سکتی تھی۔ عورت اور مرد دونوں طلاق لے سکتے تھے۔ عورت بالآخر ہے تو مرد دوسری شادی کر سکتا تھا۔ اس زمانے میں عموماً پانچ قسم کی شادیاں ہوتی تھیں۔

(۱) بادشاہ زن۔ وہ عورت جسے اُس کے والدین نے شادی میں دیا ہو۔

(۲) اوک زن۔ وہ لڑکی جو اپنے والدین کی اکلوتی ہے۔ جب اُس کا بیاہ ہو تا تو اُس کے والدین دولہا سے یہ وعدہ لے لیتے کہ اُس کے پہلے بچے کو اُنہیں اپنے پاس رکھنے کا حق ہو گا۔

(۳) ستر زن۔ پندرہ برس سے زیادہ عمر کا مرد بن بیاہا جاتا تو اُس کے عزیز ایک لڑکی کو جہیز دے کر کسی شخص سے بیاہ دیتے جس کے عرصہ میں وہ عورت مرنیکے بعد دوسری دنیا میں متوفی شخص کی بیوی سمجھی جاتی! اور زائے حیات میں اُسکی جس قدر اولاد ہوتی اس میں سے نصف متوفی شخص کی اور نصف اپنے دنیوی شوہر کی قرار دی جاتی۔

(بقیہ صفحہ ۱۲۸) **انگلستان کی عورتیں** (جلہ حقوق محفوظ)

(از مولانا مرحوم و مغفور)

اخباروں کی دنیا میں عورتوں کے آجانے سے بہت سے وہ خاص سچکٹ چھو گئے ہیں جن کو صرف عورتوں سے تعلق ہے۔ جن میں سب سے زیادہ اہم چیز فیشن اور لباس کی قطع و برید ہے اس قسم کی باتوں میں کسی جگہ کے مردوں کو لطف نہیں آتا۔ مگر انگلستان اور دیگر ممالک میں عورتیں ترقی کر کے اس درجہ پہنچ گئی ہیں کہ قطع نظر ان اخباروں اور رسالوں کے جو خود عورتوں کے ہاتھ میں ہیں وہ رسالہ اور اخبار بھی جن کی ایڈیٹری کی کرسی پر مرد بیٹھے ہوتے ہیں اسی امر پر مجبور ہو گئے ہیں کہ اپنے پرچوں کے اشاعت میں ضرر پہنچ جانے کے خوف سے دو ایک صفحہ فیشن اور سچکٹوں کے اندر کر دیں جن کو خاص عورتوں کے مذاق سے تعلق ہے آپ کے یہاں عورتوں کا لباس بُرا ہو یا بھلا جیسا ہو ایک حالت پر ٹھہرا ہوا ہے مشکل اس میں کسی قسم کی اصلاح کی بھی جائے تو اس کا اثر دو ہی تین گھنٹوں تک محدود رہتا ہے۔ بخلاف اس کے وہاں ان اخباروں کی وجہ سے اور نیز اس وجہ سے کہ مغز معزز لیڈیان شہر کی سیر کرنے اور باغوں کی ہوا کھانے آتی ہیں۔ عورتوں کا لباس روز بروز ترقی کرنا جاتا ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ لندن کی ہر سڑک اور ہر باغ کو لباس کی تلاش و خراش اور بانپس کی حیثیت سے ایک نمائش کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ جہاں ان چیزوں کا مقابلہ اور اس کے ساتھ ایک دوسرے سے انخذ کرنے کا موقع ملتا ہے۔

علمی ترقی سے وہاں کی عورتوں کے حوصلہ ایسے بڑھ گئے ہیں کہ وہ اب ان تمام کرسیوں تک پہنچنا چاہتی ہیں جو اس وقت تک صرف مردوں ہی کے لیے مخصوص ہیں۔ وہ پارلیمنٹ کی ممبر بننا چاہتی ہیں۔ وہ یونیورسٹیوں اور دارالعلوموں کے انتظام میں شرکت کی دعوے دار ہیں۔ اور قریب زامہ آگیا ہے کہ وہ کسی بڑے پادری اور ریشی کی خدمت کی بھی آرزو مند ہو جائیں۔ اور چونکہ اس وقت تک ان تمام مقامات سے مردوں کو ڈھکیل رہی ہیں۔ لہذا یہ خیال عام طور پر عورتوں میں پھیلنا جاتا ہے کہ مردان کو ترقی سے روکتے ہیں۔ اگرچہ اگلے قوانین میں بہت کچھ ترمیم ہو گئی اور وہ فرق بھی مٹ گیا جس کی وجہ سے مسلمان سچیت کو الزام دیتے تھے کہ ان کے وہاں باوجود اس آزادی

کے عورت کے حقوق مرد سے کم رکھے گئے ہیں یعنی شادی کے بعد عورت اپنی جائیداد پر بھی قابض نہیں رہتی تھی۔ اور قانوناً شوہر کا قبضہ ہو جاتا تھا۔ اب عورتیں اپنی جائیدادوں کی مالک ہیں جو اپنے نام سے رہن نامہ اور بیعنامہ کر سکتی ہیں مگر اس پر بھی عورتوں کو اطمینان نہیں ہوا۔ اور آج بھی اُن کی زبان پر یہ کلمہ جاری ہے کہ انگلستان کا قانون مردوں کی طرف داری کرتا ہے۔ اور وہ یہ کہ گرجے کے قانون کے مطابق شادی کے بعد ایک حد تک عورت کو مرد کا تابع فرمان ہونا پڑتا ہے۔ طلاق کے مقدمات میں اگر مرد کی طرف سے درخواست ہو تو صرف عورت کا زمانہ ثابت کر دینے پر طلاق مل جاتی ہے۔ اور سب سے زیادہ نمایاں فرق یہ ہے کہ اگر عورت کی درخواست ہو تو ضرور ہے کہ مرد کے زنا کے ساتھ یہ بھی ثابت کرے کہ اُس نے اُس عورت پر ظلم بھی کیا۔ اور حقیقت میں یہ قانون کچھ فضول سا معلوم ہوتا ہے قطع نظر عورتوں کو دو باتوں کا بار ثبوت ڈالنے کے یہ بڑی لغویت ہے کہ اگر کسی شریف مرد یا عورت کو کسی اندرونی جھگڑے یا مصلحت سے طلاق کی ضرورت لاحق ہو جائے تو قانون کا دروازہ اُن پر بند ہے اور وہ مجبور ہیں کہ اپنی کسی جائز غرض حاصل کرنے کے لیے زنا کے بہت بڑے گناہ کے مرتکب ہوں۔ یہ قانون انصاف یہ ہے کہ ایک حد تک زنا کار کی جرائم دلاتا ہے۔ الغرض یہی باتیں ہیں جنکی وجہ سے عورتیں موجودہ قانون سے روز بروز زیادہ ناراض ہوتی جاتی ہیں۔

شاید گزشتہ سال ہی کا واقعہ ہے کہ ایک شریف لڑکی نے جو نہایت تعلیم یافتہ اور عورتوں کی ایک معزز سوسائٹی کی سکریٹری بھی تھی۔ انھیں مندرجہ بالا وجوہ پر نکاح کرنے سے قطعاً انکار کر دیا اور صاف کہہ دیا کہ جب تک مجھ کو قانون میں ترمیم نہ ہوگی میں شادی نہ کروں گی۔ مان باپ نے مجبور کرنا چاہا اور جیسا اُن کی کسی طرح نہ چلی تو اُنھوں نے ایک ڈاکٹر کی مدد سے لڑکی کو مجنون بنا کے پاگل خانہ میں پہنچا دیا۔ لیکن جیسا اُس سوسائٹی کو یہ خبر پہنچی تو دوسری ممبر عورتوں نے مقدمہ عدالت تک پہنچا دیا۔ وہ لڑکی ایک قومی مجاہد کی شان سے پاگل خانہ سے باہر نکلی اور مقدمہ نے بہت طول کھینچا اگرچہ مان باپ نیک نیتی کے بنا پر بری کر دیے گئے۔ مگر ڈاکٹر بہت الزام آیا۔

اسی ایک لڑکی پر سو توں نہیں آزادانہ تعلیم نے وہاں ایسی ہی صد ہا
 اور ہزار لڑکیاں پیدا کر دی ہیں۔ جو نہایت ہی استقلال اور جرأت کے ساتھ اپنے
 حقوق کے لیے لڑ رہی ہیں۔ جن کی مذکورہ بالا اوالو العزیموں کو شاید آپ اپنے خیال
 میں نہ پسند کرتے ہوں گے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ انھیں کے مبارک ہاتھوں سے بعض
 ایسے اہم کام اجرا پائے گئے ہیں جن کی ادھر آپ کا کائنات بھی داد دینے لگے گا۔
 انھیں کی سرگرمی سے وہاں ایک ایسی سوسائٹی قائم ہو گئی ہے جو ان مان باپ
 سے سخت باز پرس کرتی ہے جو اپنے بچوں پر ظلم کریں۔ ایسی سوسائٹی کی شاید آپ
 کے بیان ضرورت نہ ہو گی۔ مگر وہاں اس کی سخت ضرورت ہے اس لیے کہ اس سرزمین
 میں لوگوں کی اور خاصہ غریبوں کی اولاد بہت کثرت سے ہوتی ہے نو دس بچہ اولاد
 کی اوسط تعداد ہے۔ اور چونکہ ذریعہ معاش تنگ اور زندگی بسر کرنا بہت گران
 ہو گیا ہے اس لیے اکثر ان باپ اپنے بچوں پر ظلم کر بیٹھتے ہیں۔ ایسے واقعات وہاں
 روز پیش آتے رہتے ہیں۔ اولاد کی طرف سے وہاں بے پرواہ ہونے کے چند اور وجوہ
 بھی ہیں جن کا حال آپ کو آگے چل کر میرے بیان سے معلوم ہو گا۔ بہر تقدیر یہ سوسائٹی
 اپنے جاسوسوں اور خبر رساؤں کے ذریعہ سے ایسے واقعات کا پتہ لگاتی رہتی ہے۔
 اور جہاں کوئی واقعہ اٹھ لگ گیا فوراً مقدمہ عدالت میں بھیج دیا جاتا ہے۔ اور
 سوسائٹی کی طرف سے وکیل یا بیرسٹر حاضر عدالت ہو کے پیرونی کرتا ہے۔ تمام تعلیم فتنہ
 اور لائیں عورتوں کو اس سوسائٹی سے پوری حد دی ہے۔ اور اپنے پاس پڑوس
 میں جہاں کسی کو اپنے بچوں پر جو رو تشدد کرنے دیکھتی ہیں فوراً سوسائٹی کے سرکاری
 کو لکھ بھیجتی ہیں اور ساتھ ہی تحقیقات شروع ہو جاتی ہے۔

انھیں بچوں اور خاصہ لڑکیوں کے لیے اور بھی بہت سے ایسے انتظام
 کر دیے گئے ہیں کہ ملک کی عورتیں روز افزون ترقی کرتی جاتی ہیں۔ وندہ رکسل کا
 نام آپ میں سے اکثر حضرات نے سنا ہو گا۔ جہاں ملکہ معظمہ اکثر اوقات تشریف رکھا
 کرتی ہیں۔ عالیشان قصر ایک متوسط درجہ کے قصبہ میں واقع ہے جس کی آبادی ۲۵
 ہزار کے قریب ہے اور یہ قصبہ وندہ زک کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں ایک سوسائٹی
 خاص لڑکیوں کی خبر گیری کے لیے قائم ہے۔ جن کے مان باپ غریب ہیں۔ اور اولاد

کی خبر گیری نہیں کر سکتے ہیں۔ اسی لڑکیوں کو یہ سوسائٹی اپنی زیر نگرانی ایک مکان میں رکھتی ہے۔ سن بلوغ اور خود اپنی خبر گیری کر سکنے کی عمر تک تعلیم دلاتی ہے کھانا پکڑا دیتی ہے۔ ضروریات زمانہ کی تعلیم دلاتی ہے۔ اور جب وہاں سے اگلنے کے قابل ہو جائیں تو ایسے کاموں سے لگا دینے کی کوشش کرتی ہے۔ جن سے وہ بسر اوقات کر سکیں۔ گذشتہ ماہ اس سوسائٹی کے سالانہ جلسہ میں وہ خادہ بھی گئی تھی جو خود میل کام کرتی تھی۔ اس کی تین بہنیں اس سوسائٹی کے زیر حمایت پر درس پڑھ رہی تھیں اور اسی کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ بارہ سولڑکیوں کے قریب اس وقت اس سوسائٹی کے زیر نگرانی تھیں۔ یہ کام بھی انھیں لائق اور تربیت یافتہ خاتونان اگلی نسل کا ہے۔ جن کی برائی یا بھلائی ہنوز آپ کے بیان زیر بحث ہے۔

اس موقع پر مجھے یہ بھی بیان کر دینا چاہیے کہ وہاں لڑکے ہوں یا لڑکیاں دونوں کی تعلیم زیادہ تر کوشش اس بات کی کیجاتی ہے کہ وہ بورڈنگ ہوس میں بھیجے جائیں بات یہ ہے کہ آپ کے بیان بچوں کی پرورش و تعلیم میں ان باپ ایک حد تک یہ امید رکھتے ہیں کہ یہ بچے بڑھاپے میں ہماری خدمت کریں گے اور اُس وقت جبکہ ہمارے دست و پا کام دینے سے رہ جائیں گے ہمارے کام آئیں گے۔ وہاں برخلاف اس کے ان باپ کا خیال کبھی اس طرف جاتا ہی نہیں۔ وہ صرف مجبوری کے ساتھ نیچر یا قانون قدرت کا حق ادا کرتے ہیں اور جب تک بچے سن بلوغ یا تینز کو پہنچیں ان کی نگرانی کرتے رہتے ہیں۔ عورت اور مرد دونوں کو چونکہ اپنے نفسانی اور ذاتی حظوظ کا زیادہ خیال رہتا ہے۔ لہذا بچوں کی پرورش میں بھی اسی حد تک تن دہی کیجاتی جہاں تک کہ اپنی آسائش میں خلل نہ پڑے بچوں کی پرورش میں چونکہ کوئی ذاتی غرض اور امید نہیں ہوتی لہذا ان باپ کو اور اعلیٰ الخصوص ماؤں کو ان کے ساتھ ویسی بے صبری کی محبت بھی نہیں ہوتی جیسی کہ ہندوستان کی ماؤں کو اپنے کنبہ کے مکرڑے کے ساتھ ہوا کرتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ اکثر ان باپ جن کی آمدنی کم ہے۔ یا جو بعسرت بسر اوقات کرتے ہیں۔ اولاد کی طرف سے بے پروا ہو جاتے ہیں۔ بلکہ بعض سیدوں تو اس فکر میں ہو جاتے ہیں کہ کسی طرح قانون کی حد سے بچے کو معصوم بچوں سے اپنا چچا چھڑا لیں۔ وہاں میان بی بی و دونوں کا یہ جی چاہتا ہے کہ گھر میں ہر وقت اکیلے

ہیں۔ میان ہر گھڑی بی بی کے آغوشِ محبت میں اور بی بی عاشقِ میان کے گلے کا ہار
 رہیں۔ جو عشقِ لیلیٰ کو مجنون کے ساتھ ہو گا وہ انگلستان میں قریب قریب ہر مرد کو اپنی
 بیوی کے ساتھ اور بیوی کو اپنے میان کے ساتھ ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جہاں انسا
 عشق ہو اور جہاں ہر وقت ایک دوسرے کے حُسن اور صحبت کے مزے اڑانے کی فکر
 ہو۔ وہاں غریب بچے کس قدر کانٹے کی طرح کھٹکتے ہوں گے۔

بورڈنگ ہوس جو وہاں خوب آباد ہیں اور لڑکوں اور لڑکیوں سے خوب
 بھرے ہوئے ہیں۔ اسکی وجہ ہمارے بیان اکثر لوگ انگریزوں کی علم لیلیٰ سمجھے
 ہوئے ہیں۔ یہ نہیں کہتا کہ ایسا نہیں ہے۔ مگر زیادہ تر اس کی تائید اور تفصیل صرف
 اس خیال سے ہوتی ہے کہ ماؤں کو اُن بورڈنگ ہوسوں سے اپنے عیش میں
 خلل ڈالنے والے بچوں سے چھپا چھڑا کا عمدہ اور نہایت شائستہ موقع مل گیا ہے۔
 تمام متوسط درجہ کے لوگ جو سالانہ سو ڈیڑھ سو پونڈ خرچ کر سکتے ہیں۔ اپنے بچوں
 کو اُن بورڈنگ ہوسوں میں بھیج دیتے ہیں جو سو اچھی کے اوقات کے ہمیشہ گھر اور ان
 باپ سے جدا ایک دوسری دنیا میں رہا کرتے ہیں۔

اس موقع پر مجھے یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ عورتوں میں کس قسم کی ورزشوں
 کا زیادہ رواج ہے۔ اصل میں لڑکیوں کے لیے وہاں صرف ٹھلنا اور تین چار میل
 چل لینا کافی سمجھا جاتا تھا یا ٹینس کھیل لیا کرتی تھیں۔ اور بعض امیر زادیاں گھوڑے
 کی سواری کرتی تھیں۔ مگر اب عورتیں روز بروز شایستہ کر لی جاتی ہیں کہ کبھی کبھی
 اُن کے لیے مفید اور ضروری ہے۔ وہ کرکٹ اور فٹ بال کھیلتی ہیں کشتیاں چلاتی
 ہیں۔ لڑکوں کی طرح ڈرل اور قواعد کرتی ہیں۔ نشاۃ اندازی کی مشق کرتی ہیں
 شکار کو جاتی ہیں۔ اور اب بیان تک نوبت پہنچ گئی ہے کہ باکسنگ یعنی کشتی اور
 فینٹک یعنی تیغ زنی میں بھی مہارت حاصل کرنے لگی ہیں۔ اُن کو دعویٰ ہے کہ تیار
 و انداز میں ہی انہیں بلکہ ایک سرکٹ سپاہی کی حیثیت سے بھی وہ میدانِ جنگ میں جاسکتی
 ہیں۔ ان ورزشوں کا یہ اثر صاف ظاہر ہو گیا کہ عورتیں بمقابلہ سابق کے قد قامت
 میں بہت بڑھتی جا رہی ہیں۔ اور ایک گھڑی بھر کے لیے بھی آپالڈن کی کسی سڑک پر گھڑے
 ہو جائیں تو آپ کو صاف نظر آجائے گا کہ وہاں کی عورتیں قد قامت اور توانائی

میں ساری دنیا کی عورتوں سے بڑھی ہوتی ہیں۔ میں نے وہیں ایک اخبار میں پڑھا تھا۔ کہ گزشتہ ۲۰ سال کے عرصہ میں عورتوں کے قد کی اوسط درازی چار یا پانچ انچ بڑھ گئی ہے۔ بہت سی عورتیں ایسی نظر آتی ہیں جو میان کے بڑے سے بڑے مردوں سے بھی زیادہ بلند بالا اور قوی ہیکل ہیں۔

بورڈنگ ہاؤس کے بعد جب اوسط درجہ کی تعلیم ہو لیتی ہے تب ماں باپ لڑکوں کو اور اکثر لڑکیوں کو خود انھیں کے مذاق کے مطابق بہ حیثیت ایک اپرنٹس یعنی کارآموز کے کسی کارخانہ میں یا کسی مشہور پیشہ والے کے پاس بھیج دیتے ہیں۔ وہاں بھی بورڈنگ ہاؤسوں کی طرح سالانہ ایک رقوم ادا کیجاتی ہے جس کی تعداد سو پونڈ سے کم نہیں ہوتی۔ اور لڑکوں کا کھانا اور ان کے ضروریات کا انتظام اسی رقوم سے کیا جاتا ہے۔ ان فرض ایک معمولی تعلیم کے بعد کسی پیشہ سے لگا دینا اور کمانے کے قابل بنادینا ماں باپ کا فرض سمجھا جاتا ہے۔

لڑکوں اور لڑکیوں کی شادی کرنا وہاں ماں باپ کا فرض نہیں ہے یہ خود ان کا ذاتی کام ہے۔ لڑکے جب کچھ روپیہ کمانے لگتے ہیں تو وہ برابر اپنے ذاتی مصارف سے کچھ رقوم بچانا شروع کرتے ہیں اور جب وہ رقوم اس مقدار اور تعداد کو پہنچ جاتی ہے کہ وہ ایک نیا گھر قائم کر سکیں تب شادی کا ارادہ کرتے ہیں اور لڑکیوں کی طرف اسی غرض سے متوجہ ہوتے ہیں کہ ان میں سے کسی کو اپنی زوجیت کے لیے چھائیں۔ یہ تو لڑکوں کا حال تھا۔ مگر لڑکیاں تعلیم پانے کے بعد ہی اگر کسی جگہ نوکری ہو گئیں یا کسی کام سے لگ گئیں تب تو نہایت اطمینان اور فارغ البالی کے ساتھ اس امر کا اندازہ شروع کرتی ہیں۔ کہ کس سے شادی کریں اور کون ایسا شخص ہے جو ان کے ساتھ زندگی بھر اچھی طرح نباہ کرے گا۔ اس انتخاب میں ان کو جلدی اور غلبت نہیں ہوتی۔ سالہا سال گزر جاتے ہیں اور وہ اسی طرح کنواری بیٹھی رہتی ہیں۔ عورتوں کے اس طبقہ میں جو نوکری پر بسر کرتا ہے یا جو اپنی معاش کا ذریعہ آپ پیدا کر لیتا ہے۔ میں نے ہزار ہا ایسی عورتیں دیکھیں جن کی جوانی ختم ہو گئی اور چالیس پچاس برس کی عمر کو پہنچ گئیں۔ مگر اسی طرح کنواری بیٹھی ہیں۔ اور آج تک مہر کے نام سے یاد کی جاتی ہیں۔ اور آپ

کی بدگمانی کے خلاف میں نے ان میں بہت کم عورتوں کو خراب اور بے عصمت پایا۔ یہ بھی نہیں جیسا کہ بیان مشہور ہے کہ اُن کو شوہر نہیں ملتے۔ نہیں ملتے ہیں اور کثرت سے ملتے ہیں مگر ایسے جن سے اُن کو بیاہ کا اطمینان نہیں ہوتا۔ اور ان کے ساتھ شادی کرنے کے مقابلہ میں وہ زندگی بھر کنواری بیٹھا رہنا پسند کرتی ہیں۔ یہ تو اُن لڑکیوں کا حال تھا جو اپنے ذریعہ معاش کو پیدا کر لیتی ہیں۔ رہیں وہ لڑکیاں جو خود کمانے کے قابل نہیں ہیں۔ ان میں درحقیقت نکاح کے متعلق زیادہ بے صبری ہے۔ وہ درس گاہوں کے چھوڑتے ہی شوہر کی تلاش میں مشغول ہو جاتی ہیں۔ اور اس میں ان باپ سے بھی ان کو کافی مدد ملتی ہے۔ ان میں معشوقیت کی شان پیدا کرنے کے لیے والدین کو کپڑوں اور آراستگی کے سامانوں کا زیادہ اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ شوہر کی جستجو پہلے اسی محلہ اور قرب و جوار بلکہ عزیزوں سے شروع ہوتی ہے اور جب اس حلقہ میں کامیابی نہیں ہوتی تو جیسے کا دائرہ اور وسیع کر دیا جاتا ہے۔ اکثر وہ بات میں رہنے والے ان باپ اپنی لڑکیوں کو لندن میں بھیج دیتے ہیں جو وہاں کے اصطلاح میں انتخاب شوہر کا سب سے بڑا میدان ہے۔ اور وہاں کی سوسائٹی میں شریک ہونے اور باہمی دعوتوں میں آنے جانے اور نو جوانوں کے ساتھ ناچنے سے بہت جلد اچھے شوہر مل جاتے ہیں یہ نہیں جہاں کے موسم میں جبکہ طرح طرح کی دلچسپی کی صحبتیں جاری ہو جاتی ہیں۔ اکثر جاہل عین لطف و زیادہ کھینے کے لیے میس میں کشتیوں پر سیر کر کے لطف زندگی اٹھاتی ہیں۔ اور برائے نام بائیں بائیںٹ لیا رڈ کے ایسے ساحلی مقاموں میں جا کے سیر و تفریح میں مشغول ہو جاتی ہیں۔ اس وقت خوش حال بلکہ متوسط الحال ان باپ کا یہ فرض ہوتا ہے کہ اپنی لڑکیوں کو بھی ان مقامات میں بھیجیں تاکہ اُن کو ایک اچھے شوہر کے دستیاب کرنے کا عمدہ موقع ملے۔ اور میں کہتا ہوں کہ انھیں لڑکیوں کی عصمت خطرے میں ہوتی ہے اگرچہ ان میں اپنے بچانے اور اپنی عصمت کی حفاظت کرنے کی بخوبی لیاقت ہوتی ہے۔ لیکن کہیں ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ بعض بد معاش و دشمنان نوع انسانی ان کو دولت و عشرت کا ہنر باغ دکھانے کے بے عورت و بے آبرو کر ڈالتے ہیں۔ اور جہاں کوئی لڑکی اس طرح خراب ہوئی۔ اور اس کی خرابی چار پانچ کے کان تک پہنچ گئی۔ پھر وہ ایسی خراب ہوتی ہے کہ نہ دین کی رہمتی ہے اور نہ دنیا کی۔ میرے خیال میں لڑکیوں کو جیسی سخت سزا نہ ملنی چاہیے کہ وہ ان پر ملتی

ہے ویسی دنیا کے کسی حصہ میں شاید نہ ملتی ہوگی پھر یہ نہ نرفا کی سوسائٹی میں شریک ہو سکتی ہے۔ نہ کوئی ملتا ہے۔ اور نہ کوئی اس سے نکاح کرتا ہے۔ مان باپ نے اگر ترس کھا کے مگر میں رہنے دیا تو چند روز خاموش پڑی رہتی ہیں ورنہ سوا اس کے کہ فاحشہ عورتوں میں مل کے اپنی معاش کو سڑکوں پر ڈھونڈھتی پھر بن اور کسی طرح اپنا پیٹ نہیں پال سکتی ہیں میرے خیال میں انگلستان میں جس قدر افسوسناک حالت ان عورتوں کی ہے۔ اور کسی کی نہیں۔ ان کو نوکری بھی نہیں ملتی۔ اور سوا بدکاری کے اور کوئی پیشہ اختیار نہیں کر سکتی ہیں۔ اسی امر پر اکثر ناول نویسوں نے زور دیا ہے۔ اور ان غریب عورتوں کی طرف پہلک کو نہایت سوز و گداز کے الفاظ میں متوجہ کیا ہے۔ اور چونکہ مردوں کو زنا کی کوئی سزا سوسائٹی سے نہیں ملتی۔ لہذا تعلیم یافتہ عورتیں اس کو قانون سوسائٹی کا بہت بڑا ظلم خیال کرتی ہیں۔ اور صاف کہتی ہیں کہ مردوں کے مقابلے میں عورتوں پر بڑا ظلم ہوتا ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ ان عورتوں کی حالت بیان کی بیوہ عورتوں سے بھی زیادہ خراب اور ذلیل ہو رہی ہے۔

الغرض مندرجہ بالا طریقوں سے وہاں جب لڑکیاں اپنے لیے شوہر منتخب کر پاتی ہیں تو نکاح ہو جاتا ہے۔ نسبت ٹھہرانے کا یہ طریقہ آپ کے خیال میں کتنا ہی شرمناک اور مخدوش ہو۔ مگر انگلستان اس سے بہت بڑا فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اور میرے خیال میں انگریزوں کی ترقی کا پہلا ہی ذریعہ ہے۔ ان لڑکوں اور لڑکیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو آپس میں شادی کا اقرار کر لیتے ہیں۔ اور چونکہ جب تک نیا گھر آباد کرنے کے قابل روپیہ نہ فراہم کر لین شادی نہیں کر سکتے۔ اقرار کے بعد بھی وہ لوگ روپیہ فراہم کرنے کی طرف نہایت کٹچڑی سے متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اور اس قدر متوجہ ہو جاتے ہیں کہ ان کو دنیا کی کسی لذت میں بہت کم مزہ ملتا ہے جس مکان میں رہتا تھا اس کے پڑوس ہی میں ایک نو عمر لڑکا تھا۔ جس کی عمر بیس برس کی ہو گئی۔ اس سے اور ایک لڑکی سے نکاح کا اقرار ہو گیا تھا۔ یہ لڑکی ڈیڈ ز میں جو وہاں سے تین میل کے فاصلے پر تھا رہتی تھی۔ اور ہر اتوار کو یا یادہ اپنے آئندہ شوہر سے ملنے کے لیے آتی تھی۔ یہ لڑکا حارس میرا بہت بڑا دوست تھا۔



(از جناب لطافت حسین صاحب)

بقیہ صفحہ ۱۳۶

(۴) چاکر زن۔ جس بیوہ کے کوئی اولاد نہ ہو اور وہ دوبارہ شادی کرے۔ تو اسے اس نام سے پکارتے۔ دوسرے شوہر سے جتنے بچے ہوتے ان میں سے نصف پہلے شوہر کے سمجھے جاتے اور جب وہ مر جاتی تو تمام رسوم میں اسے پہلے ہی شوہر کی بیوی کہا جاتا۔

(۵) خود سرن۔ وہ عورت جو اپنے ماں باپ کی مرضی کے خلاف شادی کرے۔

عہ پر فیسر حکیم زادہ حال کے پاریسون کی رسم شادی کے متعلق لکھتے ہیں کہ ہندوستان اور ایران دونوں میں شادی کی عمر ۲۰ سے ۳۰ برس تک مرد کے لیے اور ۱۴ سے ۱۹ سال تک عورت کے لیے موزون سمجھی جاتی ہے بعض اوقات چھوٹی عمر میں بھی خصوصاً ایران میں بیاہ دیتے ہیں والدین کی رضامندی کے علاوہ بڑے پردہ پرستی کی اجازت بھی ضروری ہے ہندوستان میں قاعدہ ہے کہ نکاح کے وقت دو لہا اور دو لہن دونوں سامنے بیٹھتے ہیں اور جابین کے گواہوں کے اقرار کے بعد دو پردہ پرست سامنے کھڑے ہو کر کچھ دعا پڑھتے ہیں جن کا کچھ حصہ ہندوؤں سے لیا گیا ہے اور سنسکرت زبان میں ہوتا ہے۔ ایران میں دو لہن دو لہا کے سامنے نہیں آتی۔ نکاح کے وقت عزیز و اقارب سب جمع ہونے ہیں پھر ایک پردہ پرست آتا ہے اسکے داہنے جانب دو لہا بیٹھا ہوا اور دو لہن کے نامیدے ہوتے ہیں اور بائیں جانب دو لہا کا باپ اور دیگر اعرہ ہوتے ہیں۔ دو لہن کا نامیدہ دو لہا کو شکر کی ایک ڈلی دیتا ہے جسے وہ قبول کر کے کھالیتا ہے پھر دیگر رسم کے بعد پردہ پرست کل کا خطبہ پڑھتا ہے جسے ”انداز گواہ“ کہتے ہیں۔ بعد ازاں طرفین کے لوگ ایک دوسرے کو شکر باندھتے ہیں اور رات کا کھانا کھا کر سب امان دو لہن کو لیے ہوئے جوہر سے پیر تک ایشی بسان بن چھپا ہوتی ہے۔ دو لہا کو گھر پہنچ کر رسم طلاق ادا کر دیتے ہیں۔

اولاد

ایرانی کثرت اولاد کو نہایت درجہ موجب برکت سمجھتے تھے اور لڑکوں کو لڑکیوں پر ترجیح دیتے تھے۔ یہ خیال آج تک موجود ہے۔ فتح عیساہ تاجار کے تین ہزار سے زیادہ بال بچے تھے۔ قدیم زمانے میں جن کی اولاد زیادہ ہوتی اُسے بادشاہ ہرل انعام و اکرام عطا کیا کرتا۔ جس کی اولاد نہ ہوتی اُسے بڑا بد نصیب تصور کیا جاتا۔ وہ کسی لڑکے کو لے کر متبنی کرتا ورنہ اُسکی روح کو چنود کے پل پر سے گرنے کی اجازت نہ ملتی۔ اگر اتفاق سے وہ اس فرض کو ادا کیے بغیر مر جاتا تو اُس کا پردہ ست اور عزیز اقارب کسی لڑکے کو اُس کے نام سے متبنی کر لیتے اور اس طرح اُسے دوزخ کی آگ سے نجات دلاتے۔ بچوں کے لیے والدین کی اطاعت اور فرمانبرداری بہت بڑا فرض کی گئی تھی۔ ان کی شادی بیاہ کا اُنھیں پورا اختیار تھا۔ اور اُن کی مرضی کے بغیر لڑکے کوئی کام نہ کرتے تھے۔

تعلیم و تربیت

دو تین سال تک ماں خود اپنے بچے کو دودھ پلاتی اور عموماً پانچ سال کی عمر تک وہ گھر میں رہتا اسکے بعد ایک مرد انا بیت کے سپرد کر دیا جاتا۔ اوستا نین مذہبی تعلیم کی سخت تاکید کی گئی ہے۔ مگر تھامش سپاہی اور جنگجو تھے۔ ان کے زمانے میں امرائے لڑکوں کو زیادہ تر جنسی تعلیم دی جاتی تھی۔ اور طرح طرح کی

عہ اس زمانے کی ثروت کا انحصار کثرت اولاد و موشیون پر تھا وندیدادین لکھا ہے: آتش و عاسکند کہ گلہ۔ گاونہ فرزندان براسے تو زیادہ بشوند و دوسری جگہ نو بد مقدس آتش سے خطاب کر کے اس طرح دھا مکتا ہے۔ عطا فرزند نیکہ جاس سکونت بیا بند و نزدیک من باشند در مہنگام خطر تہمت نمایند قہر مانان بشوند و امور معیشت و کارخانہ مارا اصلاح و ترقی بدہند (ایران نامہ) عہ افلاطون کہتا ہے کہ سات برس تک شہزادے کی تربیت خواجہ مرکزنا۔ سواری اور شکار کرنا سکھاتا۔ چودہ برس کے بعد شہزادہ اُسکی کفالت سے نکلی کے چار موبدون کے سپرد ہوتا جو اُسے فلسفہ اور احکام شریعت کی تعلیم دیتے۔ قوانین حکمرانی سے آگاہ کرتے اور سب سے زیادہ جن اخلاق و راست گوئی کی تلقین کرتے اور یہ عہد و پیمان لینے کو جب تک زندہ رہے صداقت و راستی کو ترک نہ کرے۔

زرنوفن لکھتا ہے کہ شہزادوں کا مکتب شاہی محل کے سامنے تھا۔ اس حارت کی چار حصے تھے۔ اول میں پانچ سے سولہ برس تک کی عمر کے لڑکے تھے۔ ان کی تعلیم بجائے لکھنے پڑھنے

دور ز شون اور قواعد سے جہانی کالیف کا عادی بنا دیا جاتا تھا۔ پایہ تخت میں محل شاہی کے قریب اور دوسرے شہروں میں مزر بان کے محل یا کسی دوسری عمارت میں ان کو رکھا جاتا۔ لڑکے بازاروں کے قریب ہرگز نہ جاتے تھے تاکہ دروغ گوئی اور دھوکہ دینے کی عادات نہ پڑ جائے۔ صبح سویرے ایک گھنٹہ سچا۔ فوراً سب لڑکے اپنے بستروں پر سے اٹھ بیٹھتے اور ان کی پچاس پچاس کی جامعین کسی شہزاد یا وزیر زادے کی ماتحتی میں ایک جگہ جمع ہو جاتیں۔ تو اعداد شروع ہوتی۔ دوڑ دھوپ کرتے۔ گھوڑوں پر سوار ہو کر سرپٹ دوڑاتے ہوئے اترتے اور چڑھنے کی مشق کرتے۔ نیزہ بازی۔ شمشیر زنی۔ تیر اندازی۔ اور شناسوری وغیرہ میں مشغول رہتے۔ وہ جانور بھی چراتے اور کھلے میدانوں میں رات بھر جاگتے بسر کرتے۔ سخت دھوپ میں گھنٹوں دوڑاتے جاتے اور برتنا اور کرہ سے بین دریاؤں کو پار کرتے۔ ان کی غذا رڈی نمک اور اُبلایا گوشت تھا جب میس برس کے ہو جاتے تو فوج میں کوئی ادنیٰ افسری دیجاتی یا بعض کو ملکی عہدے بھی مل جاتے۔ اس غرض کے لیے سیاسی تعلیم بھی نصاب میں داخل تھی۔ ان کو قانون بھی سکھایا جاتا اور پائے کا درنا دار اور العزیزین کی داستانیں سنا کر ان کی ہمتیں بلند کی جاتیں۔

(بقیہ صفحہ ۱۴۷) کے اخلاق ستودہ۔ راست گوئی۔ اطاعت بزرگان اور قناعت و سادگی کو بھی شہسواروں کی تیر اندازی اور زور و بین افگنی میں بھی اُٹھینا ہر بنایا جاتا۔ دوسرے حصے میں دس سال تک رہتے اب بادشاہ کے ہم کار یا سردنکا پر بھی جاسکتے۔ اور اسی زمانے میں ثباتی۔ باغیانی۔ بخاری۔ اصول ملک داری اور عدالت وغیرہ کی تعلیم حاصل کرتے۔ تیسرے حصے میں فنون جنگ کی تکمیل ہوتی اور میدان جنگ میں جا کر شجاعت و بہادری کے جوہر دکھانے۔ چوتھے درجے میں قوانین شرع۔ آئین و دوا و فلسفہ اور دیگر علوم و فنون کی تکمیل کیجاتی۔

ظاہر ہے کہ یہ تعلیم ہر شخص کے لیے نہ تھی۔ بلکہ مختلف طبقہ کے لوگ اپنی ضرورتوں کے لحاظ سے اپنی اولاد کو تعلیم و تربیت دیتے تھے۔ فردوسی شہزادوں کی تعلیم کو متعلق شاہنامہ میں مندرجہ ذیل آیتیں ہر شاہزادہ کے لیے تھیں۔

نشدت کرد جلن نیسار۔ جان بازو شاہین یوزو شکا۔ زبید داد و در زخت و کلا۔ سخن گفتن و زرم و زادن سپاہ ہنر ایا و ختنش سر بسر۔

بے رنج برداشت کا دہر

پر دہتوں کے لڑکے عموماً مذہبِ حکمت اور قانون کی تعلیم حاصل کرتے۔ انھیں لکھا پڑھنا بھی سکھایا جاتا۔ مگر کتابیں بہت کم تھیں۔ زیادہ تر حافظہ پر دار و مدار تھا۔ قدیم زمانے میں کوئی خاص عمارت تعلیم گاہ کے لیے مخصوص نہ تھی۔ یہ دہت کا گھر یا آتش کدہ کے ملحق کوئی کمرہ کافی سمجھا جاتا تھا۔ مگر ساسانیوں کے زمانے میں خصوصاً عہدِ نوشیروان میں بہت سی ترقیاں ہوئیں اور جندشاپور میں ایک بہت بڑا دارالعلوم بنایا گیا جس میں حکمت فلسفے اور ادب وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اور دوزدور کے لوگ وہاں آکر اس سے مستفید ہوتے تھے۔

تہوار اور جشن قدیم ایرانی تہوار اور خوشی منانے کے بڑے شائق تھے۔ خصوصاً اپنے بادشاہ کی سالگرہ کے دن بڑی دھوم دھام کرتے اس دن ایک بہت بڑا دربار منعقد ہوتا۔ نذرین پیش ہو تین اور شہنشاہ کی داد و دہش سے لوگ بالامال ہوتے عوام الناس اپنے اپنے اچھے کپڑے پہن کر عیرون اور دوستوں سے ملے جاتے۔ طرح طرح کے تماشے اور عین ہونین سرکون پر مہندی اور قسم قسم کے پھول اور پتیان ڈالی جاتیں اور ہر طرف خوشبوئیں سلگائی جاتیں۔

قدیم ایرانی چونکہ زراعت پیشہ تھے لہذا اُن کے جشن بھی زراعتی ضروریات اور تغیر اوقات فصل چارگانہ پر مبنی تھے اور کسی خاص مہینے سے انھیں تعلق نہ تھا۔ علامہ آلبوریحان البیرونی نے ان تہواروں کا بالتفصیل ذکر کیا ہے۔ مگر وہ زیادہ تر ساسانیوں کے عہد کے حالات لکھتے ہیں تاہم اس میں شک نہیں کہ مذکورہ ذیل جشن نہایت قدیم تھے۔ اور عرصہ دراز تک ملک میں مقبول عام رہے۔

(۱) نوروز۔ یہ قدیم زمانے سے ایران کا قومی تہوار ہے جسے آج کل بھی وہاں کے باشندے گوسلمان ہیں مگر ہر سال مناتے ہیں۔ اس تہوار کو جمشید نے اپنے زمانہ حکومت کی یادگار میں اُس دن مقرر کیا تھا جب آفتاب برجِ حمل میں آتا ہے۔ ساعاتِ شب و روز مساوی ہوتے ہیں۔ ہری پدکا آغاز ہوتا ہے۔ (۲ مارچ) اور بہار کی آمد آمد سے نباتات و حیوانات میں ایک نئی روح پیدا ہو جاتی ہے۔ اسے آغاز سال نو نہ سمجھنا چاہیے کیونکہ قدیم زمانے میں نئے سال کی ابتداء زمانہ خزان سے شروع ہوتی تھی جبکہ جشنِ مہرگان ہوتا تھا مگر

آجکل ایران کے پارسی اپنا سال نو جیستہ نوروز ہی سے شروع کرتے ہیں۔
 (۲) مہرگان۔ فریدون نے جب دشمن قوم قحماک پر فتح پائی تو اُس کی خوشی میں یہ
 جشن منعقد کیا گیا جسے آج کل بھی تمام پارسی ہر سال مناتے ہیں اور تمہارے نیاز و تندر
 کرتے ہیں۔ یہ زمانہ وکتوبد میں جب سورج بُرج میزان میں آتا ہے یعنی ۳۰ ستمبر کو
 شروع ہوتا اور چھ دن تک رہتا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ مہرگان کے زمانے میں
 عید گو فویا یا گوجن (مغان کش) بھی منائی جاتی تھی۔ اس دن بقول مورخین
 یونان مغان اپنے گھر سے باہر نہ نکلتے تھے۔ اگر وہ کہیں باہر دیکھ لے جاتے تو ذلیل کیے
 جاتے۔ وجہ یہ تھی کہ اسی زمانے میں محوس گومتا یعنی جھوٹا پردیہ جس نے سلطنت
 ایران کو غصب کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ داراے اعظم کے اٹھوں مارا گیا تھا۔ یہ ایک
 امر اتفاقی تھا۔ ورنہ اُس کے مارے جانے کی خوشی میں کوئی خاص جشن نہیں مقرر
 کیا گیا۔ عجیب بات ہے کہ آج کل بھی ایران میں ۹ ربیع الاول کو عید الزہرا ہوئی
 ہے جس میں سینوں کا مضحکہ اڑایا جاتا ہے اور کوئی سنی باہر نکلتا ہے تو ذلیل
 و خوار کیا جاتا ہے۔

(۳) جشن بندہ۔ یہ تہوار مونگ کے آگ کو معلوم کرنے کی یادگار میں تھا۔ اس دن
 ہر گھر میں آگ روشن کی جاتی تھی۔ تمام تشکدے اُس روز چراغان ہوتے تھے۔ اور
 جوق جوق لوگ عبادت کرتے آتے تھے۔ یہ تہوار صرت کیا یون کے زمانے تک رہا
 اور موسم زمستان میں منعقد ہوتا تھا۔

(۴) جشن تیرگان۔ یہ تہوار موسم باران میں ہوتا تھا۔ اور کیا یون کی ایجاد تھا۔ ستار
 تشر (یا شعرا) مینہ اور خوشحالی کا دیوتا ہے وہ اپنے دشمن پوش (ورثرا) یعنی
 خشک سالی کے دیوتا پر فتح پاتا ہے۔ اور مینہ برساتا ہے۔ مشہور ہے کہ منوچہر نے اسے
 قائم کیا تھا۔ بعد کے زمانے میں اہتیا یعنی منہ کی دیوی کے لیے بھی آبان میں ایک
 جشن ہونے لگا۔

(۵) جشن مُردگان۔ یہ تہوار بھی کیا ہی زمانے سے شروع ہوا۔ عام عقیدہ تھا کہ سال
 کے آخری دس دنوں میں مُردوں کی رو صین دنیا میں آتی ہیں۔ اور اپنے عزیزوں
 سے نذر و نیاز کی خواستگار ہوتی ہیں اس لیے سب لوگ اس زمانے میں بڑی تیاریاں

کرتے تھے۔ ہر گھر میں ایک مخصوص جگہ مقرر کر دی جاتی تھی۔ جہاں سب خاندان والے جمع ہو کر اپنے مُردوں کو نیاز و نذر چڑھاتے تھے۔

(۶) موسمی تہوار۔ سال کے مختلف موسموں میں چھ تہوار ہوتے تھے جن کا زیادہ تر تعلق زراعت اور کاشتکاری سے تھا۔ ہر تہوار پانچ روز تک نہ ہتا تھا۔ ہر گاؤں اور ہر شہر کے لوگ ایک جگہ جمع ہو کے دعوتیں کرتے۔ سفید کپڑے پہنتے اور اپنی حیثیت کے مطابق نذرین لاتے۔ جنھیں بہرہمت موسمی دیوتاؤں پر چڑھاتے اور دعائیں مانگتے تھے۔

سارانیوں کے زمانے میں بھی یہ تہوار بڑے جوش و خروش کے ساتھ منائے جاتے تھے۔ علامہ البیرونی نے لکھا ہے کہ نوروز کے دن بادشاہ ایک بڑا دربار منعقد کرتا۔ رعایا کی نذرین قبول کرتا اور اُن کو انعام و اکرام سے سرفراز کرتا۔ بادشاہ کی طرف سے ایک بہت بڑی دعوت بھی ہوتی تھی جس میں بکثرت لوگ مدعو کیے جاتے اور طرح طرح کے تاج رنگ اور تماشے ہوتے۔ ہر گان کے دن ایک بہت بڑا میلہ ہوتا جو اس قدر مقبول ہوا کہ ایک ماہ تک قائم رہتا۔ اس میلے میں بادشاہ اپنے سر پہ ایک تاج جو ہر نگار رکھے جس پر آفتاب کی شکل بنی ہوتی تھی۔ بعد ازاں سارانیوں نے بعض تہوار خود بھی قائم کیے۔ مثلاً فیروز کی جہاد عا مقبول ہوئی۔ پانی بردار اور ملک کا قحط عظیم دور ہوا۔ تو اس نے اس خوشی میں ہر سال ایک جشن منعقد کرنے کا حکم دیا۔

تفریحات جشن وغیرہ کے علاوہ ہین ہین نامیین معلوم کہ عوام اناس کی تفریح طبع کے اور کیا سامان تھے۔ گراہیرون اور ریمسون کے لیے بکثرت دلچسپ شاغل تھے۔ شکار کا خاص شوق تھا۔ اور وہ شیر۔ گورخر۔ بارہنگے۔ جنگلی سور اور

عہ شکار کے شوق کا ایک بہت بڑا سبب یہ بھی تھا کہ اس سے عودی درندے کم ہو جائیں مذمبایہ بہت ثواب کا کام سمجھا جاتا اور اسے حاصل کرنا رتھسارون کا عین فریضہ زندگی تھا۔ اگر کوئی بہادر سوراکسی ہیوب جانور کو مارنا تو سارے ملک میں اُسکی شہرت ہو جاتی۔ لوگ اس کے قصے اور کہانیاں بنا ڈالتے۔ اور رفتہ رفتہ طرح طرح کی غلط روایتیں مشہور ہو جاتیں۔ چنانچہ محلات چخا منشی میں ایسے عجیب و غریب واردندوں کی تصویریں نظر آتی

غزلوں کے پیچھے سرگردان رہتے تھے۔ کشتی گھوڑ دوڑ۔ تیرہ بازی۔ اور چوگان کا بھی عام رواج تھا۔ آناج گانے اور موسیقی کا بھی بڑا ذوق تھا۔ چنگ۔ تار۔ طبل اور دیگر طرح طرح کے آلات موجود تھے۔ جوے۔ پانسے۔ اور نرد کا بھی شوق تھا۔ اور نوشیروان کے زمانے میں شطرنج بھی رائج ہو گئی تھی۔

اکل و شرب

ابتداءً ایران و غیرہ سب کی غذا نہایت سادہ تھی۔ بعد کے زمانے میں تکلفات اس قدر بڑھ گئے کہ ایرانی کھانے ساری دنیا میں مشہور ہوئے۔ غریب لوگ صرف سرسوں اور بانی پر گزارہ کر لیتے تھے۔ گھوٹ اور جو کا زیادہ رواج تھا۔ وٹیا عام طور پر تنور میں پختی تھیں۔ تدرکاری۔ دو دھ۔ اور گھی کے علاوہ گوشت سب کی عام غذا تھی۔ گھوڑے۔ بیل۔ بھیر۔ بکری۔ گھاسے۔ شتر مرغ۔ اور ہرن کا گوشت مرغوب تھا۔ بچھلی اور تپندرہ کا گوشت بھی کھایا جاتا تھا۔ بڑی بڑی دعوتوں میں گھوڑے اور بیل مسلم پاکر دسترخون پر رکھ دیے جاتے تھے۔ ایرانی میوؤں اور پھلوں کے بڑے شائق تھے۔ کچھ اور انگوڑے ان کے لباس میں بکثرت پیدا ہوتے تھے۔ جن سے شرمیل بھی بنتی تھیں۔ آدسا میں شراب کی تولید کی گئی ہے۔ اور ہوا کی شراب نہ ہوتا۔ نہ کبھی گئی ہے۔ اس لیے شراب کے سب شائق تھے۔ روزانہ کھانے کے ساتھ پیئے۔ اور ہوا۔ دس۔ تو میخواری کی کوئی حد نہ رہتی۔

غریب لوگ زمین پر بیٹھ کر ہاتھ سے کھانا کھاتے۔ لیکن امرا سبز اور کرسی پر بیٹھ کر کھاتے۔ چاندی کے برتنوں میں کھاتے تھے۔ دعوتوں کے موقعوں پر اکل و شرب کا سلسلہ بہت دیر تک جاری رہتا۔ لوگ اپنے معاملات پر رات ہی کے وقت شراب پی کر سوئے کرتے اور دوسرے دن پھر اُنھیں باتوں پر غور و خوض کر کے باہم کوئی راسخ نام کر لیتے۔

عہد سغریٰ (۵۰۰) بیتا جو نہایت مہیب ہیں اور جن کا اس دنیا میں کبھی وجود نہ تھا۔ اگرچہ بھی اسی قسم کا ایک جانور ہے۔ اس کے چار ہاتھ ہیں جن کے پنجے شیر کے ایسے ہیں۔ وہ سفید پیر ہیں۔ عقاب کے اندر رہے۔ گردن نیگنوں۔ سینہ اور پیر سرخ اور اس کا سکہ گودہ و بیا بان سے لگا ہوا ہے۔ اسی طرح سیاحت گشتا شب۔ شکار ہرام گور اور شاہ اسمے کے ہفت خواہ۔ رستم میں بھی عجیب و غریب جانوروں کا حال مذکور ہے۔

(ایران نامہ)

لباس و زیبائش

آریہ جروا ہے تھے لہذا جانوروں کی کھال اور ان کے کپڑے پہنتے ہوں گے۔ سب سے پہلے بقول فردوسی جمشید نے ادنیٰ سوئی اور ریشمی کپڑوں کو ایجاد کیا۔ مگر یہ کسی قدر مبالغہ آیز معلوم ہوتا ہے۔ قدیم ایرانی موجودہ زمانے کے بختیار یوں کی طرح لباس ہوتے ہوں گے۔ جن کا لباس ایک سوئی یا پوستینی کرتا ہے۔ جو گھٹنوں تک نیچا ہوتا ہے۔ اس کی آستین کلائیوں تک پہنچتی ہے۔ کمر میں ایک ٹپکے ہے۔ سر پر ایک ڈھیلی ڈھالی نندے یا دون کی ٹوپی اور پاؤں میں چمڑے کے جوتے ہیں۔ ساسانیوں کے زمانے میں عام لوگ تسمور کی سفید ٹوپی یا بگڑی پہنتے تھے۔ مگر کندہ تصویر دن کے دیکھنے سے بگڑی کا پتہ نہیں چلتا۔ امرائے تچا منش کا ایک لباس جس میں میدیا کے فیشن کا پورا اتباع کیا گیا تھا۔ نہایت پر تکلف تھا۔ ان کے ریشمی اور پرتکلف کپڑوں پر طرح طرح کے جانوروں اور پھول پیوں کی رنگین شکیں بنی ہوتی تھیں۔ یہ جامہ ایڑی یا ٹخنے تک لمبا ہوتا تھا۔ کمر سے نیچے اس میں جھول دے کے چٹھین ڈال دی جاتی۔ آستینیں کہیوں تک تنگ اور نیچے بہت کشادہ اور شکن دار ہوتی تھیں۔ سر پر ایک چوکور ادبچی سی ٹوپی تھی جس کی دیواروں پر بھی چٹھین پڑی تھیں۔ امرائے فارس کا اصلی لباس اس سے کسی قدر مختلف تھا۔ وہ ایک جست کوٹ پہنتے تھے جو گھٹنوں سے زیادہ نیچا نہ تھا۔ ان کی ٹوپی کی شکل قبہ نہ تھی۔ اور اس کی دیوار پر شکنیں نہ تھیں۔ دونوں قسم کے لباسوں کے نیچے ایک شلوار نما ڈھیلا پانچا مہ پہنتے تھے۔ کمر میں ایک زرنگار مربع ٹپکے ہوتا تھا جس میں ایک طرف خنجر لگا رہتا۔ کبھی خنجر کو چمڑے کے ایک تسمے میں لٹکا لیتے اور داہنی جانب ران پر پڑا رہتا تھا۔ اور بائیں جانب ایک بڑا سا خول ہوتا جس کے اندر کمان محفوظ ہوتی۔ پاؤں میں موزے اور جوتے تھے۔ کافون میں بالیان کلائیوں میں چوڑیاں۔ اور گلے میں بیش باطوق پہنتے تھے۔ انھیں جزدن سے ان کے مرتبے اور عہدے کا اظہار ہوتا تھا۔ امرائے اپنے چہرے پر غارہ اور آنکھوں میں سرمہ بھی لگاتے تھے۔

(باقی آئندہ)

انگلستان کی عورتیں

(بعض حقوق محفوظ)

(بقیہ صفحہ ۱۴۳)

(از مولانا شہر محمد رحیم)

لہذا اُسی کی وجہ سے مجھے اُسکی معشوقہ سے بھی ملنے کا ہر سہتہ میں اتفاق ہوتا تھا۔
 میں دیکھتا تھا کہ چار لیس کو ہمارے بیان کے نوجوانوں کی طرح نہ کسی کھیل کا شوق
 تھا نہ کسی تماشے کا۔ رات دن میں اُسے سخت محنت کرنے دیکھتا تھا۔ کسی وقت اور کسی
 گھڑی میں اس کو سوا اس کے کہ روپیہ پیدا کرنے کی فکر میں مشغول ہو اور کسی کام کی
 طرف متوجہ نہ پایا تھا۔ میں نے ایک دفعہ ٹھیکر میں جانے کی خواہش ظاہر کی تو اُس
 نے انکار کیا اور کہا: مجھے اپنی شادی کی اس قدر فکر ہے کہ کسی کام میں دل نہیں لگتا
 میری معشوقہ مجھے کہیں جانے کی اجازت نہیں دیتی۔ اور پھر اسی کی ترابی معلوم ہوا کہ
 وہ لڑکی بھی اپنے سینے پر رونے سے جو روپیہ پیدا کرتی ہے جمع کرتی جاتی ہے۔ جب ہم تنہا
 روپیہ جمع کر لیں گے کہ الگ گھر میں رہیں اور اپنی معشوقہ سے شادی کریں اس وقت
 دنیا سے لطف اٹھائیں گے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ شادی کا شوق اس لڑکے میں کس جوہر
 شریف کا پتہ دے رہا ہے۔ اور شخص اسی وجہ سے اس کے اخلاق پر کتنا عمدہ اثر
 پڑا۔ اور یہی چیز اس کا بھی قوی سبب ہے جو میں اور پر بیان کر آیا ہوں کہ وہ ان بڑی
 اور بد معاشی نہ یادہ ترین رسیدہ لوگوں اور بڑھوں میں ہے۔ اور نوجوانوں میں کم
 ہے۔ یہی نتیجہ جن کا اوپر ذکر ہوا ایک دوسرے کے سوٹ ہارٹ یعنی دل پر اکھلاتے ہیں۔
 اور فرصت کے اوقات میں باہم باغون اور غیر آباد جنگلوں اور کھیتوں میں جا کے ایک
 دوسرے کی صحبت سے لطف اٹھاتے ہیں۔ تو ان کی شام کو آپ ذرا آبادی سے باہر نکل
 جاتے تو ہر جگہ انھیں سویٹ ہارٹوں کو بے تکلفی کے ساتھ گھاس پر اور درختوں کے
 نیچے بیٹھا اور ہم آغوش پائیں گے۔ یہ صحبت وہاں جائز خیال کی جاتی ہے۔ اور مان
 باپ بھی اپنے کاموں کا حرج کر کے بیٹھوں کو ان کے سویٹ ہارٹ کے ساتھ جانے کی
 اجازت دیتے ہیں۔

آپ تعجب کریں گے کہ ان پر بدگمانی نہیں کی جاتی۔ اور جان تک میں نے خیال
 کیا یہ حسن ظن کسی حد تک اصلیت بھی رکھتا ہے۔ اس لیے کہ جب سے وہاں اس بات کو شہرت
 ہو گئی ہے کہ اکثر لوگ لڑکیوں کو دھوکا دے کے بے عصمت کر ڈالتے ہیں۔ اور اس کے بعد شادی
 سے انکار کر دیتے ہیں۔ اس وقت سے لڑکیاں خود اپنی عزت کی بہت نگہداشت کرنے لگی ہیں۔
 ان کے خیال میں یہ بات جم گئی ہے کہ اگر خراب ہی ہونا ہے تو کسی اور سے خراب ہوں مگر

اس کو بدگمانی کا موقع نہ دین جس سے کہ شادی کی امید ہے۔ اس خیال نے لڑکیوں کو اپنی عصمت بچانے پر بہت آمادہ کر دیا ہے۔ ان تمام باتوں کا اصل اصول یہی ہے کہ وہ ان یہ امر ہر شخص کے نزدیک قطعی طور پر فیصل ہو گیا ہے کہ عورت کی عصمت کے محفوظ رکھنے کے لیے مقابلہ اس کے کہ دوسرے لوگ اور اوپر والے نگرانی کریں۔ یہ طریقہ زیادہ مفید اور قابل اطمینان ہے کہ خود عورت اپنی عصمت بچانے کی ذمہ دار قرار دی جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر عورت خود خراب ہونے پر آمادہ ہے تو کوئی ہزار کوشش اور نگرانی کرے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اور اگر عورت خود بچنا چاہتی ہے تو ہزار ہکائی اور ٹھپسلائی جائے نہیں خراب ہو سکتی۔ اس اصول پر وہ ان کا عمل درآمد ہے۔ اور اسی وجہ سے عورتیں روز بروز زیادہ مطلق العنان ہوتی جاتی ہیں۔ اور اس کے ساتھ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ اپنے آپ کو اس مطلق العنانی کا مستحق بھی ثابت کرتی جاتی ہیں۔

نکاح ہو جانے کے بعد لڑکے اور لڑکی کی زندگی بالکل بدل جاتی ہے۔ ماں باپ کے گھر سے نکل کے وہ اپنا نیا گھر قائم کرتے ہیں۔ مکان کی صفائی اور آرائشی اور خرچ کے بچانے اور کفایت شعاری کے اصول برتنے میں بی بی اپنی لیاقت اور قابلیت کے جوہر دکھاتی ہے۔ اور چونکہ مردان کاموں سے بالکل نا آشنا ہوتے ہیں لہذا قریب قریب اکثر یہی دیکھا گیا ہے کہ بی بی دالوں کے خرچ میں مقابلہ اُن لوگوں کے کفایت پڑتی ہے جو تنہا رہتے ہوں۔ خانگی انتظام یا بچوں کی پرورش گھر کے مصارف اور حساب کتاب کلیئر بی بی کے ہاتھ میں رہتے ہیں میان کا صرف یہ کام ہوتا ہے کہ جو کچھ کمائیں بی بی کے ہاتھ میں دے دیں۔ اُس میں سے جو کچھ بچتا ہے بی بی اس کو ہفتہ وار سیونگ بنک میں جمع کرتی رہتی ہے۔ صرف مکان اور بچوں کا صاف رکھنا بی بی کا فرض نہیں۔ اُس کو میان کے کپڑوں کی درستی اور صفائی کا بھی ہر وقت خیال رہتا ہے۔ وہ میان کے کپڑوں پر برش کرتی ہے اور میان کے بالوں میں اپنے ہاتھ سے برش اور گٹھی کرتی ہے۔ اور جب شوہر کپڑے پہن کر کھڑا ہوتا ہے تو آگے پیچھے پھر کر دیکھ لیتی ہے کہ کسی چیز میں کوئی عیب تو نہیں۔ الغرض جس طرح میان مائیں اپنے بچوں کو لکھی چلی کر کے اور بنا چنا

کے باہر نکالتی ہیں اس طرح وہ ان بی بی اپنے میان کو باہر نکالتی ہے۔ اور اسی وجہ سے اکثر قوموں کا یہ خیال ہو گیا ہے کہ اگر بڑی قوم سے اچھی بی بی کسی قوم میں نہیں لی سکتی۔

سوسائٹی میں شریک ہونے اور دعوتوں میں جانے کا جس قدر خیال شادی سے پہلے ہوتا ہے بعد میں باقی رہتا وجہ یہ کہ شادی سے پہلے مرد عورت دونوں اپنے لیے ایک عمدہ جوڑا فراہم کرنے کی جستجو میں ہوتے ہیں اور ہر صحبت میں اسی خیال سے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر جون اور عبادت خانوں میں جانے کا بھی زیادہ تر محرک یہی خیال ہوتا ہے۔ شادی کے بعد ان باتوں کا شوق کم ہو جاتا ہے۔ اور اگر جاتے بھی ہیں تو صرف میان کا مقصود ہوتا ہے کہ بی بی کی دلچسپی ہو اور بی بی کی غرض یہ ہوتی ہے کہ میان طلب معیشت میں زیادہ منہمک ہو کے خشک مزاج اور افسردہ دل نہ ہو جائے۔ بلکہ شادی کے پہلے سال میں چونکہ دلہا اور دلہن کو دنیاوی لطف کا زیادہ شوق ہوتا ہے لہذا صحبتوں اور تھیلے دن میں کثرت سے جاتے ہیں۔ لیکن جو جو زمانہ گزرتا جاتا ہے ان باتوں کا شوق کم ہوتا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ میان بی بی میں جیسی محبت وہاں ہوتی ہے ویسی محبت اور مالک میں شاید کم ہوتی ہوگی۔ یہ مقولہ وہیں صادق آتا ہے کہ ایک کی راحت پر دوسرے کی راحت منحصر ہے۔ یہ میں مانتا ہوں کہ طلاق کے مقدمات وہاں بیان سے زیادہ ہوتے ہیں۔ لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ وہ وہاں کی آبادی کے اعتبار سے بہت کم ہیں۔ میرے اکثر انگلش دوست جب میرے سامنے ہندوستانیوں کی موجودہ طرز نکاح پر اعتراض کرتے تھے اور کہتے تھے کہ لڑکے لڑکی نے جب ایک دوسرے کو دیکھا ہی نہیں تو ان میں موافقت نہیں قائم رہ سکتی۔ ایسے اوقات میں میں یہ کہہ کے ان کو قائل کر دیا کرتا تھا کہ جو کچھ ہو چارے بیان اتنے طلاق کے مقدمہ نہیں ہوتے اس جواب پر وہ ہنسنے لگے کہ خاموش ہو جاتے تھے۔ اور ان سے کچھ جواب نہیں بن پڑتا تھا۔ لیکن بات یہ ہے کہ اصلی حالات سے ان کو اطلاع نہ تھی۔ در نہ اس کا جواب کوئی دشوار نہ تھا۔ اپنے حالات کو آپ خوب جانتے اور سمجھتے ہیں۔

اور آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہمارے بیان عورت کی آواز گھر سے باہر تو بھل سکتی نہیں عدالت تک کیونکر پہنچے۔ شریف خاندانوں میں اس امر پر عمل درآمد ہے کہ لڑکی چاہے مرنے پر تیار ہو۔ اور یہ نہیں اچھا کہ اس کا نام اور اس کی آواز عدالت کی کمرے تک پہنچے۔ آپ خوب جانتے ہیں کہ شریفوں کے گھروں میں کتنی لڑکیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ جن کے نالائقی اور ناپاک شوہروں نے ان کی طرف سے بے پروائی اختیار کر لی ہے۔ اور وہ ایک بے زبانی کے ساتھ اپنی مصیبت ناک زندگی کو بھر رہی ہیں۔ وہ ان ایسی ایک لڑکی بھی نہ ملے گی۔ جب آپ کے بیان بھی عورتوں کو آزادی دیجائے۔ اور ان کو عدالت سے دادخواہ ہونے کا موقع ملے تو معلوم ہو جائے کہ طلاق کے مقدمات بیان زیادہ ہوتے ہیں۔ یا وہ ان۔

انگریز میان بی بیوں کی مذکورہ بالا زندگیوں سے بعض خرابیاں بھی پیدا ہو گئی ہیں۔ جو غالباً آپ کے خیال میں نہایت ہی بد نما ثابت ہوں گی۔ ادل تو وہی جو میں ادب بیان کر آیا کہ جوان دو لھا وطن اپنے بچوں کے گھر میں رکھنے کے مشکل اور مجبوری روادار ہوتے ہیں۔ دوسری طرف یہ خرابی پیدا ہو گئی ہے کہ ان کے دل خود اپنے ان باپ کی طرف سے بھی سخت ہو جاتے ہیں۔ ان کو یہ گھڑی بھر کے لیے بھی نہیں گوارا ہے کہ ان باپ کا ہلنگ بھی اُسی گھر میں ہو جس میں وطن دن رات مشق ناز اور میاں ناز برداری کرتے ہیں۔ غور طلب یہ امر ہے کہ یہ طرز زندگی اچھا ہے یا ہمارا ہندوستانی طرز کہ ایک ہی چھوٹے سے گھر میں پر دادا پر دادی سے لے کے پر پوتے بہوتے تک اور دو تین خانہ داماد گھاتے میں بھرے ہوتے ہیں۔ ایک طرف ایک بڑی بی بی آنکھوں سے غدور چار پائی پر بیٹھی پنکھا ہلاتی ہیں۔ ایک طرف پوت ہونٹھے بچہ کے پوترے سے دھور رہی ہیں۔ ایک جگہ ساس بیوؤں کی مشہور زمانہ لڑائی کا سین نظر آ رہا ہے۔ ایک جگہ خند بھاؤں میں طعنہ بازی ہو رہی ہے۔ ایک طرف بڑی ہوا پنے دو برس کے بچے کو کوٹنے میں لے جا کے ایک برنی کی ڈلی اس طرح چھپا کے کھلا رہی ہے کہ گھر کا کوئی اور بچہ نہ دیکھ لے۔ اور دوسری

طرف تو جوان پوتہ دادا صاحب سب کی آنکھ بچا کے اپنی نئی نو ملی دھن کے اشارے میں بوسہ لے رہے ہیں۔ یہ تو ایک ہندوستانی گھر تھا۔ اس کے مقابل میں ایک انگریزی گھر کو قائم کیجئے تو ایک دوسرا ہی سین نظر آئے گا۔ ایک کمرے میں میان اور بی بی اکیلے بیٹھے ایک دوسرے کی محبت سے مطلقاً اٹھا رہے ہیں۔ شراب کا دور چل رہا ہے بی بی اٹھ کے پیا نو بجاتی ہیں۔ بیان گتاتے ہیں کچھ دیر کے بعد بی بی بھی سر ملانے لگتی ہیں۔ اور آخر جوش میں آئے اٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔ اور دونوں ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈال کے ناپسنے لگتے ہیں۔ مان باپ دادا وادی اور بی بی نوکر چاکر خدانے سب ہی کچھ دیا ہے گرہے کیا کہ دادا وادی ہاتھ پاؤں سے معذور ہو کے بیکار ہو گئے۔ اور جب کسی طرح کمانے کے قابل نہیں رہے تو درک ہوس (خیر خاں) میں لے لیے گئے۔ امان باوا لندن کی کسی گلی میں ایک خراب سے مکان میں بڑے ہیں۔ اس لیے کہ دادا دن کو ایک کارخانہ میں محنت کر کے روزانہ دو تین شلنگ کماتے ہیں اور امان سلائی کرتی ہیں نیچے بورڈنگ ہوس میں بھی رہے گئے۔ نوکر چاکر میں گر نیچے باورچی خانہ میں بیٹھے ہیں۔ بلاے جائیں تو آئیں اب آپ ہی بتائیے کہ آپ کس گھر کو زیادہ پسند کرتے ہیں اس میں شک نہیں کہ ہندوستانی گھر میں بچوں کی چل پون ساں ہو کون کی جوتی ییزارند بھاوجوں کی تو تو میں میں گھر کی ناپاکی ہو بیٹوں کی بدتمیزی سے آپ کی طبیعت پریشان ہو گئی ہوگی۔ اور اس کے مقابلہ میں انگریزی گھر کی صفائی میان بی بی کی پر جوش محبت بفکری و آواز وادی دیکھ کے آپ کو بھی شائد حسد معلوم ہوا ہو گا۔ لیکن بیان بھی ممکن نہیں کہ اس خود غرض اور نفس پرست جوڑے کی مستی و عیش کے ساتھ ان کے مان باپ اور دادا وادی کے جگر خراش سین نے آپ کا دل نہ دکھایا ہو وہاں گھر بھر میں بے تمیزی تھی تو بیان بے تکلفی ہے۔ بلکہ غالباً آپ اپنے ہی گھر کو زیادہ پسند کریں گے۔ اور صاف کہہ دیں گے کہ بدتمیزی اس بے تکلفی اور ناخدا ترسی سے لاکھ درجہ اچھی ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ مذکورہ انگلش طرز زندگی میں اگرچہ مان باپ اور خاندان کے بزرگوں پر بہت برا ظلم ہوتا نظر آتا ہے۔ مگر اس میں فوائد بھی بہت سے ہیں۔ لڑکا اپنی بی بی کو جو ہندوستان کی بی بیوں کی طرح جاگڑا و غیبر منقولہ نہیں ہے ساتھ لے کے ساری فکروں سے آزاد ہو جاتا ہے اس کے دل میں الوالعزمی کے

خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ اور وہ اُن کی ہدایت کے مطابق آزادی اور بے فکری کے ساتھ دنیا کے ہر کونے میں جا کے اپنی قسمت کا خزانہ کھود نکال سکتا ہے۔ بی بی ان امور میں اس کے پاؤں کی زنجیریں نہیں دل کی دھڑکن کا قیود ہوتی ہے۔ جدھر وہ رُخ کرتا ہے اُدھر بی بی اُسکے دل کو تسلیاں اور بڑھادے دیتی ہوئی بڑے مزے کے ساتھ لے جاتی ہے۔ اور کہیں پر بہمت نہیں ٹوٹنے دیتی۔ اگر دوسری فکر میں اور گھرانے کی خبر گیری اُسکے ذمہ ہو تو وہ کبھی ایسی جرات نہ کر سکے جیسے کہ یوں سب کو چھوڑ کے اور بی بی کو کلیجے سے لگا کے وہ کرتا ہے۔

آپ اس سوانحار نہیں کر سکتے کہ انگلش لائف سے دنیا و زبرد زرتی کرتی جاتی ہو اور ہندوستانی لائف سے وہ زبرد زرتی میں گرتی جاتی ہو اس خاندانی بیفکری اور بے پروائی ہی انگلش قوم کو حقیقت میں زیادہ اہمیت بنا دیا ہے۔ وہاں کا بی اور سیکاری یا ماتھ پر ماتھ رکھ کے بیٹھنے سے زیادہ بڑا کوئی جرم ہی نہیں سمجھا جاتا۔ اور شاید اس سے زیادہ ذلت کی کوئی چیز انگریزوں کی نظر میں نہ ہوگی کہ وہ کچھ کمانہ سکتے ہوں۔ اولاد سے تو کسی امید کا وہاں اب خیال ہی نہیں باقی رہا ہے۔ درحقیقت ماں باپ اولاد کو اپنی خبر گیری کا ذمہ دار ہی نہیں سمجھتے ہیں۔ وہ اول تو یہ کوشش کرتے ہیں کہ مرتے دم تک محنت کیے جائیں اور خود اپنی کمائی پر بسر کریں۔ علاوہ برین بڑھاپے کے آخری دنوں کے لیے ہر شخص کچھ روپیہ بچاتا رہتا ہے۔ جو اس کے کام آتا ہے۔ وہ مر جانا پسند کرتا ہے اور یہ نہیں گوارا کرتا کہ اولاد کی کمائی پر بسر کرے۔ اگر لڑکے دین بھی تو وہاں کے ماں باپ لینا بچائی خیال کرتے ہیں۔ اور شاید اس وقت تک شاید وہ مادر ہی ایسے ماں باپ ہوں گے جو بالکل مفلس ہو گئے ہوں۔ اور ان کو ورک ہوس میں جانا پڑتا ہو۔ لہذا انگلش اولاد کی بے پروائی سے جو ظلم ہوتا تھا اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قوم میں غیبت و حسد زیادہ ہو گئی۔ الوالواری کے جذبات بڑھ گئے۔ یہ خلات اس کے مشرقی خاندانی لائف کا نتیجہ یہ ہوا اور ہوتا ہے کہ قوم زبرد زرتی ہمت ہوتی جاتی ہے۔ جو نوجوان کچھ کرنا چاہتے ہیں اور کر سکتے ہیں وہ بھی کچھ نہیں کر سکتے۔

عورتوں کے مزاج میں چاہے وہ دنیا کے کسی حصہ اور کسی ملک کی ہوں ایک خاص مشابہت پائی جاتی ہے جس کا نمونہ انگلستان میں بھی صاف نظر آتا ہے ایک ایسی

قوم جس کی معاشرت ہر امر میں ہماری معاشرت سے جدا گانہ ہے۔ اور جس کی عورتوں کو باہر نکلنے اور ہر محبت میں آنے جانے اور غیر بدرجہ زیادہ تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے ہماری عورتوں سے بالکل جدا ہونا چاہیے۔ مگر اس بارہ خاص میں اپنی اور اُن کی عورتوں کو ایک ہی مذاق اور ایک ہی قسم کے خیالات کا دیکھ کے بڑی ہنسی آتی ہے۔ آپ نے غور کیا ہوگا تو معلوم ہو گیا ہوگا کہ کپڑے اور زیور کا شوق شادی بیاہ کے تذکرہ اور اس امر کے دریافت کرنے کی سرگرمی کہ کس کا شوہر کیسا ہے اور کیا کماتا ہے۔ اور ان تمام باتوں کے ساتھ بہت سی فضول رسمن کی پابندی اور ہزار ہا قسم کی ضعیف الاعتقادیان طبقہ نسوان کے خصائص میں سے ہیں بعینہ یہ تمام باتیں وہاں بھی پائی جاتی ہیں یہ ضرور ہے کہ باہر نکلنے اور اخراجات کے دیکھنے سے ان میں چند اور قسم کے مباحث بھی پیدا ہو گئے ہیں۔ اور خصوصاً جب مردوں میں بیٹھتی ہیں تو کوشش کر کے زیادہ تر انہیں مباحث کو چھپاتی ہیں جن میں مردوں کی بھی دلچسپی ہوتی ہے۔ مگر اُن کا اصلی مذاق وہی ہے جو آپ کی عورتوں کا ہے۔ جب مرد و عورتیں مل کے بیٹھیں گی تو جان لیجئے کہ اسی قسم کے معاملات کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے۔ صرف تین ذکر سے ہی نہیں اس وقت تک ہزار ہا ضعیف الاعتقادیان ایسی موجود ہیں جو اُن کی اصلی شریعت کی خبر دینی میں معمولی قاعدہ ہو کر ٹکیوں کے سامنے جب کوئی اظہارِ محبت کرتا ہے اور شادی کی خواہش کرتا ہے تو ان کے دل میں بار بار یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس کو دلی محبت ہے یا نہیں۔ اس معرکہ حل کرنے کے لیے لڑکیاں جہاں اور بہت سے ٹپکے کرتی ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے کہ کوئی بھول توڑ لیتی ہیں اور اس کی چھنکریاں ایک ایک کر کے اس طرح توڑنا شروع کرتی ہیں کہ ایک پرستی ہیں "لوی" (مجھ سے محبت ہے) اور دوسری "پڑناٹ لوی" (مجھ سے محبت نہیں ہے) یہ دونوں حجت تریب دار کہتی جاتی ہیں۔ اور پچھلی پنکھڑی کے ٹوٹنے پر جو جملہ نکلے وہی اصل اور حقیقت سمجھا جاتا ہے اس وقت تک سیرٹھی کے پیچھے سے گزر جانا نہایت ہی مخوس خیال کیا جاتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس یہ بھی مخوس ہے کہ شیشہ کے دروازہ کے اندر سے پہلی کا چاند دیکھا جائے بلکہ تاکید ہے کہ اگر اتفاقاً نظر آ جائے تو فوراً شیشہ توڑ کے چاند کو بلا واسطہ دیکھ لو اسی طرح کی اور بہت سی رسمیں ہیں۔ مگر تعلیم نے یہ فرق پیدا کر دیا ہے کہ توجوان اور

نوعمر عورتوں میں یہ باتیں صرف مذاق اور دلگی کے طور پر ہیں اور بن رسیدہ بوڑھی عورتوں میں عقیدت کے ساتھ وہ ان باتوں کو اسی سنجیدگی اور متانت سے بیان کرتی ہیں جس سنجیدگی سے کہ آپ کے بیان کی عورتیں بیان کرتی ہیں۔

مذہب کا خیال بھی عورتوں میں بہت زیادہ ہے۔ مرد سو جودہ سائنس اور پچھلے فلسفہ کے اثر سے اس درجہ متاثر ہو گئے ہیں کہ ان میں مذہب کا خیال بہت کم رہ گیا ہے۔ لیکن غریب ترین چند لوجوان لڑکیوں کے سوا عموماً مذہب کی بہت باندھیں ہر مذہبی رسم کو پوری پابندی اور سرگرمی سے ادا کرتی ہیں اور خود ہی انہیں مردوں کو بھی اس کی پابندی پر مجبور کر دیتی ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اتوار کا دن عام طور پر مقدس دن خیال کیا جاتا ہے۔ اس روز تمام تھیٹر اور کل تفریح گاہیں بند ہوتی ہیں سڑکوں پر بھی لوگ آتے جاتے کم نظر آتے ہیں گھر دن میں بیٹھے ہیں اور فضول عیش پرستی کے کام کرنے سے بچتے ہیں بخلاف اس کے یورپ کے اور ملکوں میں اتوار کا دن خاص عشرت اور مہمے دار یوں کے لیے ہے تھیٹر دن اور بازار دن میں وہاں اتوار کو معمول سے زیادہ رونق ہوتی ہے۔ اگر نیز دن کی نسبت یورپ والے ریاکاری کا الزام دینے اور کہتے ہیں کہ ان کے دل میں تو مذہب کی کچھ وقعت نہیں مگر صرف دکھانے کے لیے ان باتوں کی پابندی کرتے ہیں۔ اور جہاں تک چین نے غور کیا اس کی کسی حد تک اصیلت بھی پائی۔

سب سے زیادہ جو چیز ہمارے لوجوانوں کو وہاں متحیر کر دیتی ہے وہ وہاں کی عورتوں کی بے تکلفی ہے۔ وہ ہر مرد سے نہایت ہی آزادی اور بے تکلفی سے ملتی ہیں اخلاقی ضرورت سے ان کا فرض ہے کہ جس سے ملیں کشادہ صینٹی سے اور سیکر کے کنٹریٹر اور کیسا ہی نامحرم ہو اُس کے پاس بیٹھ جانے اور باتیں شروع ہوتے ہی بے تکلف ہو جانے میں ان کو تامل نہیں ہوتا اور ان کی بے تکلفی اس حد تک بڑھی ہوئی ہوتی ہے کہ ہمارے ملک کے لوگوں کا خیال بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ ایک مرتبہ میں ایک دیہات کے آٹھنی بس میں سوار ہو کے اپنے گھر کو آ رہا تھا اس روز چونکہ پانی برس رہا تھا اور رات کا وقت تھا۔ لہذا چھت پر کھلے میں بیٹھنے کی کسی کو حرجات نہیں ہوئی۔ سب لوگ اندر بھرے ہوئے تھے۔ اور صرف ۱۴ آدمیوں کے بیٹھنے کی

Checked



قدیم تمدن ایران

بقیہ مضمون لباس و زیبائش

سلسلہ کے بلحاظ موصوفی ۱۵۰۰ء و گلداز اکتوبر ۱۹۲۷ء

ان کی ڈاڑھی اور سر کے بال سلعے اور صفات ہوتے سر کے اوپر کے بال سیدھے ہوتے گریشانی سے نئے کرگردن کی پشت تک ہوتے گرد چھانوں کی قطارین جلی جاتی تھیں۔ ڈاڑھی بہت گھنی ہوتی اور اس میں بھی ڈھائی کے پاس کے بال گھونگر دار ہوتے۔ آخر کے زمانے میں مصنوعی بال بھی استعمال ہونے لگے۔ معمولی لوگوں کے بال چھوٹے ہوتے تھے۔ بعض تصویروں میں ڈاڑھیاں منڈی ہوئی معلوم ہوتی ہیں مگر یہ غالباً خدام یا خواجہ سر ہون گے۔

عورتوں کی تصویریں مفقود ہیں اس لیے ان کے لباس کے متعلق تسلی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ مگر ایک چینی سیاح نے ساسانی زمانے کی عورتوں کے متعلق لکھا کہ وہ بناؤ شکار اور مصنوعی آرائش کی بڑی دلدادہ تھیں۔ ایک ڈھیلادھلا کرتا اور اس کے اوپر چوہہ پھینتی تھیں بعض عورتیں ریشمی گون-تنگ یا جاما اور ٹوپی اور جوتا زیب تن کرتی تھیں۔ سر کے بال نہایت خوبی کے ساتھ بنائے جاتے۔ سامنے کی آنکھوں کا پیشانی کے اوپر ایک جوڑا باندھ لیا جاتا۔ مارگر کھلے بال کھلے ہوتے پشت پر بکرتے ہتے سونے چاندی کے خوشنما چھوٹے چھوٹے پھول بالوں میں پردتی تھیں۔ موتیوں کے مارگلے میں پھینتیں۔ اس کے علاوہ مہتمم مہتمم کے بیش بازو ورون سے اپنے جسم کو آراستہ کرتیں۔ آنکھوں میں سرمہ یا کاجل لگاتیں اور خوشبودار تیل سارے جسم پر پھینتیں۔

ان پوشاکوں کے علاوہ ہر زرتشتی کے لیے مذہبی فرض تھا۔ اور پارسیوں میں اب بھی اس کا رواج ہے کہ اپنے سب کپڑوں کے بیچ ایک سفید سوتی کرتا پہنتے جسے سدرہ کہتے ہیں۔ اور کمر پر ایک ادنیٰ ٹیکہ باندھتے ہیں جو خاص طور سے بنایا جاتا ہے۔ اس ٹیکے کا استعمال اب کم ہوتا جاتا ہے۔ اور اس کے بجائے اب ایک سوتی دھاگہ یا جینو متعل ہے جسے کشتی کہتے ہیں۔ مشہور ہے کہ زرتشت سے ایک زمانہ قبل ایران کے بادشاہ جمشید نے سدرہ اور کشتی کو ایرانیوں کے امتیاز کے لیے رائج کیا تھا۔ چنانچہ اب بھی ہر لڑکے اور لڑکی کو سین بلوغ پر پہنچتے ہی ان کے پردہت یہ دونوں چیزیں خاص مذہبی رسوم کے ساتھ پہنانے ہیں۔

ایران میں سفید رنگ مہرک اور سیاہ اتمی سمجھا جاتا تھا۔

شکل و شباهت

تمام اقوام عالم میں مشہور اور ممتاز تھی۔ قدیم ایرانی آج کل کے گردوں کی طرح نہایت وجہ اور تو مند ہوتے تھے۔ ان کا قد لمبا۔ جثہ نہایت مضبوط اور بال بہ فرہی تھا چال ڈھال سادہ اور شاندار۔ آنکھیں بڑی اور چمکتی ہوئی۔ ہنڈ پشانی ناک لمبی اور سیدھی۔ اوپر کا ہونٹ پتلا اور کسی قدر خمیدہ۔ ٹھڈی گول۔ چہرہ خمیدہ اور سر نیانہ اور رنگ گورا تھا۔ یونانیوں نے خشایارشا اور داریوش کی شکل و صورت کی بڑی تعریف کی ہے۔ عورتوں کا حسن بھی مشہور تھا۔ مورخ تریونن لکھتا ہے کہ میدا کی عورتیں اپنے حسن و جمال اور قد و قامت کے لحاظ سے ساری دنیا میں بے مثل اور بے نظیر تھیں۔ زنان بابل و اشور یا مال بہ فرہی تھیں ان کا جسم دھرا تھا چہرہ کسی قدر گول اور آنکھیں مثل آہو بڑی اور نہایت دلکش تھیں۔ عورتوں کی خوبصورتی میں تناسب اعضا۔ نازک کمر۔ گورارنگ۔ دھرا جسم۔ بھرا ہوا سینہ اور نازک انگلیاں قابل تعریف سمجھی جاتی تھیں۔ فردوسی ایرانی حسن کی اس طرح تعریف کرتا ہے:

دوا بروکمان و دو گیسو کند	بالا کردار سر و بلند
دو خسارہ میانش جو قمر	دو چشمش ستارہ بوقت خور
بنا گوش تابندہ خورشید وار	فروخت ز حلقہ گوشتوار
بان از تبرہ و زبان از شکر	دانش بکل در و گوہ

دہان دلش بود گوہر فشان سخن گفتش بود گوہر فشان
 فرشتہ بخوی و چو عنبر بوی بدل مہربان و بجان مہر جوی

خصائل و عادات قدیم ایرانیوں کے اخلاق و آداب ساری دنیا میں ضرب المثل تھے۔ اُن کے دشمن یونانی بھی اُنھیں مودب ترین قوم کہتے تھے۔ وہ جسم کی برہنگی کو بہت معیوب سمجھتے۔ مجلسوں اور محفلوں میں کم سختی بلکہ خاموشی اختیار کرتے۔ اور دسترخوان پر بھی زیادہ گفتگو سے پرہیز کرتے تھے۔ بوقت طعام نہ ادمر ادمر دیکھتے اور نہ ہاتھ بڑھاتے اور پھیلاتے بلکہ جو کچھ سامنے رکھا ہوتا اُسی پر اکتفا کرتے۔ راستہ چلتے اور کوچہ و بازار میں کھانا بڑا عیب سمجھتے۔ بار بار پیچھے مڑ کے دیکھنا بھی بُرا سمجھا جاتا۔ زور سے ہنسنا یا تہقہ لگانا بڑا جانتے اور اُن حرکات ناشائستہ سے جو دوسروں کی دل آزاری و کراہت کا باعث ہوں ہمیشہ پرہیز کرتے۔ مورخ ہرودٹس لکھتا ہے کہ راستہ میں ہم مرتبہ شخص اگر ملے تو بغل گیر ہو کر بوسہ دیتے۔ اگر ایک شخص رتبہ میں کم ہوتا تو بڑا چھوٹے کے رخسار کو چومتا۔ اگر اور بھی کم درجے کا ہوتا تو مودبانہ سامنے جھک جاتا۔ وفاداری، دوستی و استقامت ان کے خصائلِ حسنہ تھے۔ راستی و پاک بازی صفاتِ اہر مزدی خیال کی جاتی تھیں۔ دروغ گوئی بدترین عیب تھا۔ اور اس کے بعد قرض لینا مکروہ سمجھا جاتا۔ کیونکہ اس سے آدمی جھوٹ بولنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور اسی لیے قدیم ایرانی تجارت اور لین دین سے بھی نفرت کرتے تھے۔ مکروہ لوگ معاملے کے بڑے بکے تھے۔ ہاتھ پر ہاتھ مار کر عہد کر لیا یا بعد میں قسم کھائی تو اُسے پورا کرنا اپنا فرض عین سمجھتے تھے۔ اداسے احسان کا بھی بہت خیال تھا۔ اور دعا کے وقت صرف اپنی ہکا آسودگی و یہودی پاکتفانہ کرنے بلکہ تمام اہل وطن اور بادشاہ کے فلاح و سائنش کے لیے ہر مزدکے حضور میں استدعا کرتے تھے۔

قدیم ایرانی بڑے فیاض اور مہمان نواز تھے۔ لیکن مصرف اور فضول خرچ بھی تھے۔ کھانے پینے میں خوب روپیہ لٹاتے تھے۔ ان کی ذہانت اور حاضر جوابی مشہور تھی۔ مگر طبیعت میں خود داری اور گھمنڈ زیادہ تھا۔ ضبط کا مادہ کم تھا۔ اور حالت پریشانی و افلاس میں ذلت گوارا نہ کرتے تھے۔ وہ دلیر اور جفاکش تھے۔ شہسواری، سیر و شکار اور جنگ جوئی میں اُنھیں بڑی خوشی ہوتی۔ امرا کے علاوہ عام لوگ نہایت سادی

کی زندگی بسر کرتے۔ جس میں تن آسانی اور عیش و عشرت کو بہت کم دخل تھا۔ مگر چون
 جون زمانہ گزر گیا ان عہدہ خصال میں کمی آتی گئی۔ دولت و ثروت نے ابتدا
 میں جان ہندیب و شائستگی پیدا کی آخر میں اُسی نے امیرِ غریب سب کو عیش بند
 بنا دیا۔ وہ سست اور کابل ہو کر غفلت میں پڑ گئے جس کی مثال میدیہ کی تاریخ
 پیش کرتی ہے کہ فقط ڈیڑھ سو برس بعد سلطنتِ اتم سے نکل گئی۔ بعد ازاں پنجش
 کا نامہ آیا۔ اور وہ بھی کچھ دنوں کے بعد اسی مرض میں مبتلا ہو گئے۔ اور یونان
 میں جب سکندر اعظم کا عروج ہوا تو وہ لوگ ویسے ہی پست ہو گئے تھے جیسے
 ہندوستان کے باشندے جن پر غیر قوم نے ایسی آسانی کے ساتھ تسلط حاصل کر لیا
 دارا سے سو مہ کی رعایا کے دنوں سے غیرت و نہت کے جذبات مفقود ہو چکے تھے۔
 قوی الجثہ اور دلیر اس وقت بھی تھے۔ مگر اخلاقیات پست ہو گئے تھے اور
 استقلال دار اس میں ایسی کمی آگئی تھی کہ دشمن نے بہ آسانی مغلوب کر لیا۔
 پھر جب بادِ دولت و حکومت غائب ہو گئی اور سارے پانچ سو برس تک غلامی کی
 مصیبتیں جھیل چکے تب کہیں حب الوطنی نے پھر جوش ارا دولت و خواری نے پرانے
 جذبات کو پھر ابھارنا شروع کیا۔ اور وہ اپنے ملک کے پھر مالک ہو گئے مگر قوم
 پار تھیا (اشکانی) کے اختلاط سے ان میں ایسی جہالت اور ایسا اُجدین آگیا
 تھا جو عہدِ پنجش میں نہ تھا۔ جمائی اور ظاہری حالت کے دیکھتے ساسانی اپنے
 اجداد سے کچھ کم نہ تھے۔ مگر داغی اور روحانی حیثیت سے ان کا مرتبہ بہت گرا
 ہوا تھا ان میں وہ شائستگی اور شرافت نہ تھی جو ان کے بزرگوں کی طبیعت
 کا خاصہ تھی۔ وہ عیش پسند اور خوش طبع تھے سیر و شکار کے شائق تھے۔ مگر
 ان کی قوتِ ارادی کمزور تھی۔ انھیں اپنے جذبات پر پورا قابو نہ تھا۔ استقلال
 اور بہادری کی کمی تھی۔ مزاج میں تلون آگیا تھا۔ دفعہ جوش میں آجاتے
 مگر بعد میں فوراً ہی ٹھنڈے پڑ جاتے۔ ہچامنشی دور میں بلند نظری اور وسعت
 خیالی بھی تعصب کم تھا اور دیگر قوموں کی اچھی باتوں کو بہت جلد اور خوشی
 کے ساتھ اختیار کر لیتے تھے۔ ساسانی سخت تنگ دل اور متعصب تھے اور
 بے سمجھے بوجھے دوسروں کی نقل کرنے لگتے۔ اپنے اجداد کی طرح ان میں بھی عام

طور پر بادشاہ پرستی کا مادہ بہت زیادہ تھا اور بادشاہ کے عادات و اطوار کا اُن پر بہت جلدی اور بہت بڑا اثر پڑا تھا۔ اگر وہ نالائق اور بزدل ہوتا تو وہ بھی کم ہمت اور بے غیرت ہو جاتے۔

ہنجامنشی زمانے کے خلاف اب اُن پر یہ دہشوں کا بھی بڑا اثر ہو گیا تھا۔ جن سے عوام کی باطل پرستی حد درجہ بڑھ گئی اور انھیں دونوں وجوہ سے طبائع کی آزادی۔ جدت اور شخصیت بھی غائب ہو گئی۔ غرض جتنا زمانہ گزرتا گیا ان کا مذاق یہودہ اور عادات ناشائستہ ہوتی گئیں۔ انتظامی قابلیت اس درجہ مفقود تھی اور جب الوطنی ایسی غائب ہو گئی تھی کہ اُن کی عظیم الشان سلطنت کا چند ہی سال میں ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔

قدیم ہندوستان میں تعلیم

(از مرزا احسان احمد بی۔ اے۔ علیگ)

قدیم زمانہ میں ہندوستان علم کا مرکز اعظم تھا۔ دنیا کا ہر گوشہ اس کی علمی شہرت سے گونج رہا تھا۔ تو نان۔ چین۔ جاپان۔ سب اس کے خوانِ کرم کے زائر رہا تھے۔ قیساغورشا اور آلبیرونی ایسے اہرین فن دور و دراز ملکوں کا سفر کر کے برہمنوں اور ریشیوں کے سامنے نانوے ادب نہ کہنے اور علم کے سرچشمہ ابدی سے سیراب ہوتے تھے۔ غرض کہ ہندوستان کا آفتاب علم اُس وقت نصف النہار پر تھا۔ جبکہ مغرب تمدن کے نام سے بھی آستانہ تھا۔

اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ ان قدیم معلمین کی کیا خصوصیات تھیں؟ جن کے شوق میں دنیا کے بڑے بڑے ماہرین فن کھینچے جاتے تھے۔ ان کے شاگرد دن سے کیا تعلقات تھے؟ ان کا طریقہ تعلیم کیا تھا۔ اس موضوع پر ہمارے ایک معزز ہندو پروفیسر نے انگریزی میں ایک مختصر رسالہ لکھا ہے۔ جو ہمارے اس مضمون کا اصلی ماخذ ہے۔

عہد یونان کا ایک بہت بڑا فلسفی تھا۔

استاد اور شاگرد کے باہمی تعلق

قدیم ہندوستان میں اساتذہ نہایت قد و عمر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ بے شبہ ان کو تنخواہیں بہت کم ملتی تھیں لیکن اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ خود ایک مفلس قانع کی طرح پُر امن زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ اور ہر قسم کے نفسانی غلوں سے قصداً اجتناب رہتے تھے۔ تاکہ وہ بید کے مطالعہ میں کسی قسم کا خلل نہ ہو۔ آج کی طرح وہ شاندار محلوں میں زندگی نہیں بسر کرتے تھے۔ بلکہ معمولی چھوٹے مکانوں میں ٹھہر کر طلبہ کو درس دیتے تھے۔ اور ایسے افراد پیدا کرتے تھے جن کے ہر قدم پر علم شمار ہوتا ہوا چلتا تھا۔

استاد کے عام صفات اور خصوصیات کے متعلق وید میں ہے۔
 ”وہ جو علم کا مخزن ہے۔ جو اپنے شاگردوں کو یہ محسوس کرا سکتا ہے کہ وہ اُن کے والدین سے ان کی ذات کا کم بھی خواہ نہیں ہے جس کے اطوار زندگی سادہ اور پاکیزہ ہیں۔ جو اپنے شاگردوں کو اس طرح تعلیم دیتا ہے ”گو بادہ واقعی حق کے متلاشی ہیں۔ جو ایک انسان قانع ہے اور مثل مہمان کے شاد و خندہ جیمن رہتا ہے۔ اور اپنے روزانہ فرائض کو نہایت پابندی کے ساتھ ادا کرتا ہے۔ یہی وہ افراد ہیں جو ان لوگوں کو تعلیم دے سکتے ہیں جو ان کے پاس آتے ہیں۔ اور درسگاہوں کو اپنا وطن بنا لیتے ہیں۔“
 اسی قسم کے اور بہت سے اقوال وید میں موجود ہیں۔ مثلاً
 ”اچھا استاد وہ ہے جو مثل آفتاب کے ہر جنبہ کو اپنے اصلی رنگ میں ظاہر کرتا ہے اور مشق و تربیت کے ذریعہ سے اپنے شاگردوں کی مخفی قوتوں کی حفاظت کرتا ہے جس کا چال چلن نہایت قابلِ عزت ہو۔ جو راست گو اور وفا کیش ہونے کے علاوہ خوبصورت ہو۔ جس کی روح نہایت پاکیزہ ہو جس کا حافظہ نہایت قوی ہو۔“

یا مثلاً

”اچھا استاد وہ ہے جو مثل آفتاب کے زمین کو تمام طرف سے ہوزن رکھتا ہو۔“

زندگی بسر کرتا ہے اور مثل بادشاہ کے ہر شخص کا دوست اور رہنما ہے۔ جوش
اُن سپاہیوں کے جو دوسروں کی بھلائی کے لیے جیتے ہیں۔ صاف دل اور بہادر
ہے اور مثل ایک وفادار بیوی کے پاکیزہ اخلاق والا ہے۔

یہ استاد کی عام خصوصیات کا بیان ہے۔ لیکن عملاً دو قسم کے استاد تسلیم کیے جاتے
تھے ایک تو وہ جن کے شاگردوں سے ذاتی تعلقات ہوتے تھے۔ اور جو اُن کے لیے معلم
اور رہنما کام دیتے تھے۔ یہ لوگ آچار یہ کہلاتے تھے۔ جن کی تعریف منو نے ان الفاظ
میں کی ہے۔

لوگ اس برہمن کو آچار یہ کہتے ہیں جو اپنے شاگرد کو مع کلید اور رہا یہ
کے وید کی تعلیم و تلقین کرتا ہے۔

دوسرے وہ جو اُپادھیاء کہلاتے تھے جو اپنی معاش کے لیے وید کے ایک حصہ یا
انگس کی بھی تعلیم دیتے تھے۔

ان بیانات سے یہ صاف ظاہر ہے کہ قدیم ہندوستان میں استاد و شاگرد کے باہمی
تعلقات کس قدر حقیقی الفت و محبت میں ڈوبے ہوئے ہوتے تھے۔ اس مسئلہ کے متعلق
ہندوؤں کے مقنن اعظم منو نے خالص زور کے ساتھ لکھا ہے۔ چنانچہ اپنی کتاب کے دوسرے
باب میں لکھتے ہیں۔

استاد کو خواہ وہ کھلیفہ میں ہوا ایسے الفاظ استعمال نہ کرنا چاہیے جن سے
دوسروں کو غیر معمولی صدمہ ہوئے۔ اس کو قولاً یا عملاً دوسروں کو کسی قسم کا
نقصان نہ پہونچانا چاہیے۔ اس کو ایسی تقریریں نہ کرنا چاہیے جو دوسروں کا
کو اس سے خوف زدہ کر دیں۔ کیونکہ یہ اس کے حصول بہشت میں مانع ہوگا
اب طلبہ کے فرائض سنئے۔

شاگرد استاد کا نہایت احترام کرتے۔ ہر روز تلامذہ استاد کو سلام کر کے سبق
شروع کرتے اور سلام کے بعد ختم کر دیتے۔ اور ہمیشہ اس کی خدمت میں مشغول رہتے
اور استاد جب کبھی قریب آتا تو تعظیماً کھڑے ہو جاتے استاد کی جگہ نہایت مقدس
میدان کی جاتی تھی۔ اور طلبہ اس پر بیٹھنے کی بھی ہمت نہیں کرتے تھے۔

۱۰ اصول تیار وغیرہ وغیرہ۔ ۱۱ منہ نفعی علوم۔ ۱۲ ان علوم کی شاخیں جن کا خرچ و بر ہے۔

ایک دوسرے مقام پر منو لکھا ہے۔

جس طرح ایک آدمی بھاؤ ڈر سے زمین کھود کر بانی حاصل کرتا ہے اسی طرح ایک فرمان بردار شاگرد اس علم کو حاصل کرتا ہے جو استاد کے اندر مخفی ہے۔

یہ تھے باہمی تعلقات استاد و شاگرد کے جو اس انتہائی ترقی یافتہ دور میں بالکل گم ہیں۔ آج تمام عالم پر خود غرضی کا ابر جھایا ہوا ہے۔ نہ استاد کی نگاہوں میں وہ محبت آمیز کشش ہے نہ شاگردوں میں وہ جو شش اطاعت یہی وجہ ہے کہ آج گواکتاب علم کے ہزاروں ذرائع موجود ہیں جن سے قدیم دنیا بالکل خالی تھی۔ اہم ہم میں علم کی حقیقی روح نہیں پیدا ہوتی۔ اور پیدا کیے ہوئے قدیم زمانہ میں استاد و شاگرد کلمات دن کا ساتھ رہتا تھا۔ آپس میں محبت دیکھا نہ گنت تھی۔ خود غرضی کا پردہ حائل نہ تھا اس لیے شاگرد استاد ایک دوسرے میں جذب ہو جاتے تھے۔ اور استاد کو جو کچھ معلوم ہوتا تھا بے کم و کاست وہ سب شاگرد کو بتا دیتا تھا۔ لیکن آج یہ حالت ہے کہ استاد و شاگرد کے درمیان میں کوئی خاص رشتہ اتحاد و ارتباط نہیں۔ دن رات میں محض چند گھنٹوں کا ساتھ رہتا ہے۔ اور وہ بھی طومار ڈکڑا ایسی حالت میں طلبہ کے دل و دماغ پر استاد کی شخصیت اور اس کے اخلاق و عادات کا کیا اثر پڑ سکتا ہے؟ اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک استاد و شاگرد میں باہمی الفت نہ پیدا ہوگی اس وقت تک شاگرد استاد کی ذات سے کابل طور پر مستفید نہیں ہو سکتا یعنی اس علم کو نہیں حاصل کر سکتا۔ جو استاد کے اندر مخفی ہے۔ اس لیے اگر ہم حقیقی علم سے سیراب ہونا چاہتے ہیں تو ہم کو استاد کی زندگی کا ایک جز بن جانا چاہیے خلک بوس کا لچون کے رہنے والوں کو یہ سن کر تعجب ہو گا کہ سقراط جھوٹے دن میں میٹھ کر درس دیتا تھا۔ اور ارسطو اور افلاطون ایسے عالی دماغ شاگرد پیدا کرتا تھا۔ جن کے علمی کارنامے اب تک دنیا میں یادگار ہیں اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ علم کا حقیقی منبع کمال کی بلند عمارتیں نہیں۔ بلکہ صرف استاد کی ذات ہے اس لیے جب تک شاگرد اس ذات سے پیوست و یگانہ نہ ہو جائے اس وقت تک حقیقی علم کے دروازے اس پر بند ہیں جی وہ مطلع نظر تھا جس نے قدیم ہندوستان کو اس وقت علم کا مرکز و اعظم بنا دیا تھا۔ جبکہ یورپ جو اس وقت ہندوستان کو ایک جاہل اور وحشی ملک خیال

کرتا ہے۔ وحشت و بربریت کا پیکر مجسم تھا کیا ہمارے لیے یہ قدیم سطح نظر قابل تفسیر نہیں
بہر حال حقیقی علم کے لیے استاد و شاگرد میں اسی قسم کے باہم خلوص آمیز تعلقات
کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ قدیم ہندوستان کے استاد و شاگرد کے درمیان میں قائم
تھے۔

(۲) بچے کی پرورش و تربیت

یہ مسئلہ جس قدر اہم اور توجہ کے قابل ہے اسی قدر ہمارے دیکھ میں آس
کی طرف سے بے اعتنائی برتی جاتی ہے اسی لیے بچوں کی صحت جسمانی میں جو
تمام دماغی اور روحانی ترقیوں کا اصلی سرچشمہ ہے قبل از وقت ضعف و انحطاط
پیدا ہو جاتا ہے۔ اور وہ دنیا کے لڈائڈ سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاتے ہیں
اس لیے والدین کا سب سے بڑا مقدم فرض یہ ہے کہ بچوں کی صحیح طور پر پرورش
و تربیت کریں تاکہ اُن کی جسمانی صحت برابر قائم رہے اور وہ دماغی مشاغل
کو کامل طور پر انجام دے سکیں۔ قدیم ہندوستان میں جس احتیاط جس ساز و سامان
کیساتر بچوں کی پرورش و تربیت کی جاتی تھی انصاف یہ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں
اس کی مثال شکل سے مل سکتی ہے۔

قدیم زمانہ کے رشی جو زندگی کو سب سے زیادہ اہم چیز سمجھتے تھے۔
ان کا اصلی مقصد لڈائڈ زندگی سے کامل طور پر مستفید ہونا تھا اس لیے اُنھوں نے
اس مقصد کے حصول کے لیے بہت سے اصول مرتب کیے تھے۔ جو علمائے کرام میں چاروں
طرف رائج تھے۔ سب سے پہلے ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ بچوں کی پرورش اور ابتدائی تربیت
کے متعلق اُنھوں نے کیا اصول قائم کیے تھے۔

یہ مسلمہ ہے کہ والدین کا جس قدر اثر بچوں کے دل و دماغ پر پڑتا ہے
اتنا کسی کا نہیں پڑتا۔ اخلاق و عادات صحت و تندرستی طرز معاشرت غرض والدین
کے حرکات و سکنات کی ایک ایک اداسہ بچہ متاثر ہوتا ہے اس لیے سب سے پہلے
رشیوں نے والدین کے طریق زندگی کے متعلق مختلف اصول قائم کیے جن میں ایک
یہ تھا کہ ان کو ایسی غذائیں استعمال کرنی چاہیں جو ان کے صحت جسمانی کے لیے مضر
نہ ہوں۔ کیونکہ بچہ پر والدین کی صحت کا اثر نہایت غیر معمولی ہوتا ہے۔ اس کے بعد ان

صفات کا تذکرہ جن کی تعلیم بچن کو عہد طفولیت ہی سے دینا چاہیے۔ مثلاً حلم و عفو
محبت و ہمدردی خلوص و ایثار زہد و تقویٰ وغیرہ وغیرہ۔
لیکن بچہ کے اخلاقی عادات پر مان کا نسبتاً بہت زیادہ اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ اگر ری
من ایک بول ہے وہ ہاتھ جو گوارہ کو جنبش دیتا ہے دینا پر حکومت کرتا ہے۔ اس لیے
ریشیوں نے بچہ کی اس عملہ اول کے طریق معاشرت کی طرف خاص طور پر توجہ کی جس کا
اثر وضع حل ہی کے زمانے سے شروع ہو جاتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ بچہ کے لیے
ان نو مہینوں میں مان جو کچھ کر سکتی ہے دنیا کی کوئی یونیورسٹی یا چرچ نہ ندگی پہرین
بھی نہیں کر سکتا۔ ذیل کے اقوال سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ قدیم ہندوستان میں
اس مسئلہ کے متعلق لوگوں کے کیا خیالات تھے۔

(۱) رحم خراب ہو جاتا ہے اگر مان اپنی قوت سے زیادہ کام کرتی ہے۔

(۲) اگر مان ادھر ادھر بیکار گھومتی ہے تو بچہ کمزور ہو جاتا ہے۔

(۳) اگر وہ بہت زیادہ سوتی ہے تو بچہ کا بل ہو جاتا ہے۔

(۴) اگر مان شراب پیتی ہے تو بچہ کا دماغ نہایت پریشان اور منتشر ہو جاتا ہے۔

(۵) ایسی غذاؤں کے کثرت استعمال سے جن سے کوئی خاص بیماری پیدا ہو۔ بچہ
میں بھی وہی بیماری پیدا ہو جاتی ہے۔

(۶) اگر حاملہ عورت بادشاہوں کے دیکھنے کی خواہش رکھتی ہے تو بچہ نہایت اقبال مند

ہو گا اگر وہ جو گیوں اور فیروں کے خیالات میں محو رہتی ہے تو اس کے بچہ نہایت
پاکیزہ خواہوں گے۔ اگر بڑے آدمیوں کے سوانح زندگی اس کے پیش نظر رہے

ہیں تو بچہ بھی اسی قسم کا پیدا ہو گا۔

یہ محض زبانی تعلیم نہ تھی بلکہ ریشیوں نے اس کے متعلق عملی اصول منضبط کیے
تھے جن کی باقاعدہ عام طور پر تعلیم دی جاتی تھی۔ چنانچہ ریشیوں نے زمانہ عمل کو دو حصوں
میں تقسیم کر دیا تھا۔ پہلے حصہ میں مان کی جسمانی طاقت کا خاص طور پر لحاظ کیا جاتا تھا
اس زمانہ میں جو حمل سے دوسرے یا تیسرے مہینہ سے شروع ہوتا ہے۔ ان کو مختلف
دوائیں دی جاتی تھیں۔ اور والدین مجمع عام میں اس اقرار کا اعلان کرتے تھے کہ
وہ اس وقت سے ہمیشہ نہایت پاکیزہ زندگی بسر کریں گے۔ اور ایسی غذاؤں استعمال

کرن گے جو رحم کے لیے مفر نہ ہوں اور اپنے کو اس طرح رکھیں گے کہ بچہ کے جسمانی نشوونما میں کوئی خلل نہ واقع ہو۔

دوسرے حصہ میں ان کی دماغی حالت کا خیال کیا جاتا تھا اس زمانہ میں جو رسم ادا کی جاتی تھی وہ یہ تھی۔ شوہر بیوی کے بالوں میں لکھی گزرا بیوی کی نظر ایک پیالہ پر جو بچے ہوئے دال چانول سے لبریز ہے جمی ہوئی ہوتی اور وہ اسی میں خاص شکل کا تصور کرتی۔ جس کا اثر وہ بچہ پر ڈالنا چاہتی اور آخر میں تمام فضا سے مکانی کو جان لیں فغموں سے جو بلند شریفانہ اور روحانی جذبات سے لبریز ہوتے ہیں معمور کر دیتی۔

ان ابتدائی مراحل کے بعد جب بچہ کی پیدائش کا وقت آتا تو ایک وسیع اور ہوا دار کمرہ انتخاب کیا جاتا۔ جہاں مختلف قسم کے لطیف ساز و سامان موجود رہتے مثلاً خوشبو، سفید کپڑے۔ شہد لگتی وغیرہ وغیرہ بچہ جب پیدا ہوتا تو وہ ایک ایسے عالم میں قدم رکھتا جس کی آب و ہوا استرا پار و حانیت سے لبریز ہوتی پُر جوش دعاؤں کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ اور منتر دہن کے مقدس نغمے ہر طرف سے گونجتے غزل کے بعد بچے کے کان میں یہ روحانی فقرہ کہا جاتا۔ تو دید (یعنی علم و حاتی) ہے تو اس واسطے پیدا کیا گیا ہے کہ خدا کو جانے اور پہچاننے کی کوشش کرے۔ اس کے بعد بچہ کے فلاح و ترقی کے لیے دست و عاملہ ہوتا۔ اور یہ رسم ختم ہو جاتی۔

دس دن تک متواتر بچہ کی اخلاقی اور جسمانی فلاح و ترقی کے لیے دعائیں مانگی جاتیں۔ گیارہویں دن خاندان کے اعضاء اجاب جمع ہوتے۔ اور نہایت غور و خوض کے بعد بچہ کا نام رکھتے۔ جو موزون۔ شیرین۔ اور بامعنی ہوتا۔ دو چار ہفتے کے بعد ایک دوسرا مفید سبق دیا جاتا۔ جس کی اہمیت کو ہم لوگوں نے آج بھی انرا اثر انداز کر دیا ہے۔

بچوں کی فطرت میں اثر پذیری کا بہت زیادہ ادہ ہوتا ہے پھر لپٹے۔ ہنرہ

زار۔ آبار دان۔ چاند سورج۔ ستارے غرض عالم کائنات کی ہر چیز کو بچہ نہایت حیرت آمیز شوق کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ بچوں کی یہ قدرتی خواہشات اکثر نہایت بے رحمی کے ساتھ دبا دی جاتی ہیں۔ اور ایک مدت دراز تک ان کو ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں زندگی بسر کرنا ہوتی ہے جہاں روشنی اور ہوا کا بھی مشعل سے

گزر رہا ہے۔ لیکن ریشیون کو یہ خوب معلوم تھا کہ بچوں کے قدرتی خواہشات کے دبا دینے سے ان کے نشوونما میں نقص آ جاتا ہے۔ اس بنا پر ریشیون نے اس مسئلہ پر خاص زور دیا ہے یعنی والدین کا یہ فرض ہے کہ وہ بچوں کو کھلی ہوئی ہوا میں لٹا دسزہ زار وغیرہ کی میرکرائین اور ان کی توجہ کو قدرت کی چیزوں کی طرف مبذول کرائیں تاکہ ان کے حواس کی شروع ہی سے تربیت ہوئی رہے۔ اور ان میں صحیفہ قدرت کے مطالعہ کا مذاق پیدا ہو جائے۔ اور گرد و پیش کی چیزوں کی ماہیت پر غور کر سکیں فرض اس زمانہ سے برابر مناظر قدرت کی سبز بچوں کے ابتدائی تعلیم و تربیت کا ایک بہت بڑا جز خیال کیا جاتا تھا۔ لیکن آج کل کے بچوں کی تو یہ حالت ہو کہ ایک مدت تک بجز ان کے گود کے اور کچھ دیکھنے نہیں پاتے۔ ہوا تو ان کے لیے زہر سے بڑھ کر ہے۔ اسی غائے نشینی کا نتیجہ ہے کہ مقور سے ہی دنوں میں ان کے قواس جسمانی مضحک ہو جاتے ہیں۔ اور قبل از وقت موت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

جب بچہ میمنے کا ہوتا۔ تو ایک دوسری رسم ادا کی جاتی جس کو دوران میں بچہ کو نہایت صاف اور ہلکی غذا میں دیکھا میں۔ اور کبھی کبھی دو چار الفاظ سکھا د جاتے۔ والدین اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتے کہ نکتہ دیگر شروع ہی سے دور کر دی جائے۔ اور مختلف حرکت کا صحیح طور پر تلفظ کریں۔ ان باتوں کے علاوہ افسانہ گوئی بچوں کی تعلیم و تربیت کا ایک خاص جز خیال کیا جاتا تھا۔ چنانچہ دوران میں ہے کہ والدین کو بچوں کو ایسے قصے سنانا چاہیے جن سے ان میں علم پرستی کا ذوق پیدا ہو۔ اور ان کو اخلاق پر اچھا اثر پڑے۔

غرض اسی طرح آٹھ برس تک بچہ کی تربیت کا سلسلہ جاری رہتا۔ جبکہ وہ باقاعدہ درس گاہ میں داخل ہوتا۔ وقت میمنہ پر بچہ ایک کشادہ اور ہوادار کمرہ میں لایا جاتا۔ جس کے وسط میں ایک بلند منبر ہوتا جس پر خوشنوا لکڑیاں نہایت باقاعدہ شکل میں رکھی رہتیں۔ منبر کے چاروں طرف گھانسون کی بنی ہوئی محرابیں ہیں جس کے ارد گرد پھولوں کے پائے آویزاں رہتے۔ کمرے کی دیوار میں مختلف قسم کی تصویروں اور عالمانہ اقوال سے آراستہ ستین فرش پر نہایت خوشنما دریاں بھی ہوئیں۔ منبر کے ایک طرف ایک شخص میٹھا ہوا

نظر آتا۔ جس کی صورت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا دماغ علم کا مخزن ہے۔ اس کا دل نہایت شریفانہ اور محبت آمیز جذبات سے لبریز ہے۔ اس کی فطرت نہایت بلند ہے اس کی روح نہایت روشن اور پاکیزہ ہے۔ اس کے پیچھے اس کے شاگردوں کی قطار میں نظر آتے ہیں۔ جب تمام لوگ بیٹھ جاتے۔ تو سب سے پہلے اس خاموشی کے عالم میں منتر و ن کی آواز بلند ہوتی۔ جس کے ساتھ ساتھ باجون کے بھی راگ بلند ہوتے۔ ان نغموں کے بعد استاد آگ روشن کجاتی۔ شاگرد اُستاد کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتا۔ اور نہایت ادب کے لہجے میں کتاہ خدا کو پچانے اور علم و وحانی حاصل کرنے کے لیے اسے آقا میں تیرے پاس آیا ہوں اُستاد نہایت محبت آمیز لہجہ میں مناسب جواب دیتا۔ اور پھر دونوں دعا کرتے۔ کہ اے خدا! تو ہم کو توفیق دے کہ ہم اپنے وعدہ دن کو برابر قائم رکھیں۔ اس کے بعد آج یہ یعنی اُستاد برہمچاری یعنی شاگرد کو زبردگانہ نصیحتیں کرتا۔ اور اس کے فلاح و ترقی کے لیے دعا کرتا۔ اور یہ شاندار رسم ختم ہو جاتی۔

دوسرے دن شاگرد اُستاد کے آستانہ پر حاضر ہوتا۔ یہاں اس کو ایک نیا عالم نظر آتا۔ نہ بلند دیواریں ہوتیں۔ نہ فرش زرین نہ ظاہری نقش و نگار۔ لیکن ایک مقدس ذات ہے۔ جو دنیاوی جاہ و جلال سے بے نیاز ہے جس کی نگاہیں روحانیت سے لبریز ہیں۔ سب سے پہلے اُستاد شاگرد کو وید کے مقدس ترین دعاؤں کی تعلیم دیتا اور تھوڑی دیر تک اپنا روحانی اثر ڈالنے کے لیے شاگرد کی آنکھوں کی طرف توجہ قلبی کے ساتھ دیکھتا رہتا۔ اس کے بعد والدین بچہ کو شفیق اُستاد کے حوالہ کر کے رخصت ہو جاتے۔ اور اب بچہ اُستاد کی محبت آمیز نگاہوں کی گود میں پرورش و تعلیم پاتا۔

بے شبہ جدید تمدن نے آج علوم و فنون کے ہزاروں دروازے کھول دیے ہیں لیکن یہ محبت یہ خلوص یہ ہمدردی یہ اطاعت آج کل کے اُستاد و شاگرد میں کم کماں نصیب ہو سکتی ہے! یہ اسی باہمی محبت و اطاعت کا اثر تھا جو قدیم زمانہ میں شاگرد کو اُستاد کا عکس کامل بنا دیتا تھا۔ اور آج بھلی ہم دیکھتے ہیں کہ ملک میں قدیم طرز تعلیم نے جو دماغ پیدا کیے ہیں جدید تعلیم بہت کم افراد ایسے پیدا کر سکی ہے؛ علمی دنیا آج ماتم کر رہی ہے کہ اب قدیم زمانہ کے دل و دماغ کے لوگ پیدا نہیں ہوتے۔ کیا موجودہ نصاب تعلیم سے جو ہماری یونیورسٹیوں میں رائج ہے۔ یہ اسید کی جاسکتی ہے کہ اسطو

منو۔ تو علی سینا۔ غزالی۔ ایسے لوگ پیدا ہوں؟ بے شبہ ان افراد کا دوبارہ پیدا ہونا بالکل ممکن ہے۔ اگر ہم اپنے بچوں کی پرورش و تربیت اسی طریقہ پر کریں۔ جیسا قدیم ہندوستان میں یا اسلام کے عہد قبل میں رائج تھا۔ اس سے یہ ہمارا مطلب نہیں کہ ہم حرت و حریت قدیم طرز تعلیم کے مقلد بن جائیں۔ ممکن ہے کہ بہت سی ایسی باتیں ہوں جو موجودہ رفتار زمانہ کے لحاظ سے علی صورت اختیار نہ کر سکیں۔ تاہم جو کچھ اس میں اور جدید ضروریات کے مطابق ہے اس کی تقلید سے ہم کو بہت کچھ فائدہ پہونچ سکتا ہے۔ بچوں کی ابتدائی پرورش و تربیت۔ شاگرد استاد کے باہمی مخلصانہ تعلقات ان چیزوں کی اہمیت سے کون شخص انکار کر سکتا ہے؟

اصول تعلیم

ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ قدیم استاد کے پیش نظر کیا اصول ہوتے تھے اور ان میں وہ کہاں تک علما کا سیلاب ہوے ہم کہہ چکے ہیں کہ سب سے پہلے شاگرد استاد سے مخاطب ہو کر یہ کہتا تھا "خدا کو پہچاننے اور علم و روحانی کو حاصل کرنے کے لیے اے آقا! میں تیرے پاس حاضر ہوا ہوں استاد جواب دیتا ہے کہ اے عزیز بچے میں تجکو خدا کے سپرد کرتا ہوں کہ وہ تجکو اپنی روشنی سے فیضیاب کرے۔ اس کے بعد جن علوم کی تعلیم کا استاد وعدہ کرتا ہے ان میں سب سے پہلے پُران و دیان ہے (یعنی علم و روحانی)

غرض ان تمام باتوں سے یہ ظاہر ہے کہ "تزکیہ نفس" استاد کا سب سے بڑا مطمح نظر ہے یعنی سب سے پہلے طلبہ کے اخلاق کی تہذیب و تنقیح کی جائے۔ لیکن آج اس کا نام و نشان بھی دکھائی نہیں دیتا ہے۔

دوسرا اصول جس کو معلم شاگرد کے سامنے ہمیشہ پیش نظر رکھنا وہ تھا ذی روح مخلوق کے ساتھ محبت و ہمدردی رکھنا۔ آجاریہ شاگرد سے کہتا ہے میں تجکو خدا کے سپرد کرتا ہوں کہ تو تمام ذی روح کائنات کو اسن دے "اس خیال کو بار بار شاگرد کے سامنے دیتا ہے اور خود بھی اس پر عمل کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ وہ ہمیشہ علما کی ممان و نوازی میں مصروف رہتا ہے اور جب بھی اس پاس کر رہے والوں پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو وہ سب سے پہلے مع اپنے شاگردوں کے

ان کی مدد کے لیے اس مقام پر موجود ہو جاتا ہے۔ اس عملی تعلیم کا جو نتیجہ ہوتا تھا۔ وہ ظاہر ہے۔ طلبہ میں اوائل عمری سے ہمدردی اور محبت کی صلاحیت پیدا ہو جاتی تھی اور وہ عالم کائنات کی ہر جاندار شے کو محبت کی نگاہ سے دیکھنے لگتے تھے اسی بنا پر قدیم ہندو جانوروں کے گوشت سے سخت متنفر رہتے تھے۔ اور یہ خیال آج بھی ہندوؤں میں بہت بڑی حد تک قائم ہے۔

اس کے علاوہ طلبہ میں حقوق تمدن اور وطنیت کا بھی احساس پیدا کیا جاتا تھا۔ چنانچہ جب شاگرد استاد کے گھر میں داخل ہوتا تھا تو دعا کرتا تھا کہ اے خدا تو مجھ کو نیک دے کہ میں اپنے خاندان اور اپنی قوم کے علاوہ دوسروں کی بھی امداد و خدمت کر سکوں۔

حق پرستی ایک دوسرا بہت بڑا اصول ہے جو ہمیشہ استاد و شاگردوں کے پیش نظر رہتا تھا چنانچہ پانچ بار استاد و شاگرد اس مفولہ کو دہراتے ہیں۔ "خدا کرے کہ ہم جھوٹی باتوں کو چھوڑ دیں۔ اور حق کو تلاش کریں۔ علاوہ اس کے باپ اپنی دوامی تقریر میں بچہ کو حق پرستی کے متعلق نہایت پر جوش الفاظ میں نصیحت کرتا ہے۔ اس تعلیم کا جو نتیجہ تھا اس کا اندازہ گزشتہ تاریخ سے ہو سکتا ہے لوگ نہایت نیک نیتی سے کام لے کر بار کرتے تھے نہ جھوٹے وعدہ کرتے تھے۔ نہ مختلف جرائم کے مرتکب ہوتے تھے۔

علاوہ اس کے طلبہ میں شیفنگی حسن کا بھی مذاق پیدا کیا جاتا تھا۔ چنانچہ آغاز تعلیم کے وقت شاگرد دعا کرتا ہے کہ اے خدا تو مجھ کو اپنے سایہ رحمت میں لے کر اس قابل بنا کہ میں خوبصورت مناظر کی روحانی کیفیت کو محسوس کر سکوں۔ اس میدان میں قدیم ہندوؤں نے جو حیرت انگیز کمالات حاصل کیے۔ ان کا اندازہ ہندوستان کے کھنڈروں میں اصفہکی سنگتراشی وغیرہ کے باقی ماندہ نمونوں سے ہو سکتا ہے۔ موسیقی اور شاعری تو ہندوستان کے خمیر میں تھی۔

استاد کی توجہ آج کی طرح شاگرد کی محض دائمی تربیت تک محدود نہ تھی بلکہ طلبہ کی جسمانی تربیت و فلاح بھی استاد کا ایک بہت بڑا فرض تھا۔ چنانچہ استاد باغات و مقررہ رشتی اعضا قوت وغیرہ وغیرہ میں بہانہ و تاج ہمیشہ شاگرد کے پیش نظر کرتا رہتا تھا۔ اور ان کو جسمانی ورزشوں کی ترغیب دیتا رہتا تھا۔ یہ اسی

حفظانِ صحت کا اثر تھا کہ لوگ قدیم زمانہ میں سیکڑوں برس تک جیتے تھے۔ آج کی طرح وہ دھان پان نہیں ہوتے تھے۔

آخر میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اُستاد عام تعلیم کے ساتھ ساتھ علمی فنون کی بھی تعلیم دیتا تھا۔ تاکہ وہ دنیا میں بہت آرام سے زندگی بسر کر سکیں اور اُن کو کسبِ معاش کے لیے در بدر کی خاک نہ چھاننا پڑے چنانچہ ہندوؤں کے قدیم ترین کتابوں میں جدید تمدن کے اکثر علمی فنون کا تذکرہ موجود ہے۔ جن میں ہندوؤں کو معذہ بہ کمال حاصل تھا۔ مثلاً تجارت کیسا پارچہ باقی جزا حی وغیرہ وغیرہ اس لیے ان کو تعلیم کسبِ معاش کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ ایک طرف علم کو خالص علمی حیثیت سے پڑھتے تھے اور دوسری طرف معاش کے لیے دیگر فنون کو حاصل کرتے تھے۔ لیکن آج یہ حالت ہے کہ ایک مدت کے بعد ہمارے طلبہ کالجوں سے نکلتے ہیں تو بچے علم کی خدمت کے معاش کی فکر دامنگیر ہو جاتی ہے اور در بدر کی ٹھوکرین کھاتے رہتے ہیں۔

تھے اصولِ قدیم تعلیم کے جن سے آج ہماری یونیورسٹیاں بالکل نا آشنا ہیں کیا اُستاد کا فرض محض اتنا ہی ہے کہ وہ طلبہ کو چند ٹھٹھے تعلیم دے کر الگ ہو جائے؟ کیا اُن کے اخلاق کی تربیت اس کے فرائض سے خارج ہے؟ کیا قدما کے یہ ترین اصول ہمارے جدید اُستادہ کے لیے قابلِ تقلید نہیں ہیں؟ ہاں اگر آج ہمارے دل و دماغ علم و فنون سے بھر دے جاتے ہیں۔ لیکن ایسے علم سے ہم کو کیا فائدہ جبکہ ہم اخلاقی درجہ میں حیوانوں سے بدتر ہیں ہم کو ایسے انسانوں کی ضرورت نہیں جو علمی منبر پر نہایت مقدس صورت لیکر نمودار ہوتے ہیں۔ لیکن جب بدستانِ عیش میں بیٹھے ہیں تو ایسا کھل کھیلنے ہیں کہ شرم دم حیا آکھیں بند کر لیتی ہیں۔ ناظرین خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایسے لوگوں کا طلبہ یہ کیا اخلاقی اثر پڑ سکتا ہے جو خود محتاجِ تربیت ہوں اہم ابھی حقیقی فلاح و نفعی کے لیے ان خاک نشینوں کے پر توفیق کے محتاج ہیں جو اب صرف علم و فن کے سراپا شال ہیں اور دوسری طرف فضائلِ اخلاق کے پیکر مجسم۔



۱۹۲۷ء! تو ہمارے کام اور حورے چھوڑ کر خاموشی سے چل دیا
تو جب آیا تھا تو ہم کو تجھ سے بہت سی امیدیں تھیں اور ہمیں تیرے ساتھ ایسا
خلوص تھا کہ ہم سمجھتے تھے کہ تیرے پیش رو نے جو ظلم و ستم ہم پر کیا ہے وہ تیرے
عہد میں تبدیل ہو جاتی ہو جائے گا۔ مگر افسوس تو نے اپنے ۶۵ سالوں میں کوئی بات
بھی ایسی نہ کی کہ ہم تیرا کچھ افسانہ بن کر مریجو الے کو بُرا کہنا یا اُس کی برائیوں کا افسوس
کرنا نہ چاہا۔ لہذا ہم ایسے واقعات سے چشم پوشی کرتے ہیں اور اُن کے تذکرے
سے اپنے صفحات گندہ نہ کریں گے۔ اہم تیرے عہد کے اُن واقعات کا ذکر کرنا جو لوگوں
رسالہ دنگل کے ساتھ یکے بہت ضروری ہیں۔ تیرے سارے عہد میں رسالہ دنگل کی
اشاعت کا انتظام خراب رہا اور ایک رسالہ بھی وقت پر نہ شائع ہو سکا۔ جنوری و
فروری کے رسالے اپریل میں اور مارچ و اپریل کے رسالے مئی میں شائع ہوئے۔ اس
کے بعد خیال تھا کہ مئی کا رسالہ مئی میں شائع ہو جائے گا۔ اور انشاء اللہ آئندہ ہر رسالہ
اپنے وقت پر نکلتے گا مگر ایسا نہ ہوا بلکہ پورے چار ماہ کے بعد مئی و جون و جولائی کے مشترک
رسالے ماہ اکتوبر میں نکلا پڑے۔ اور پھر شروع دسمبر میں اگست و ستمبر و اکتوبر نکلتے۔ ان
رسالوں کے شائع ہونے سے خیال تھا کہ آخر دسمبر یا شروع جنوری بن بیٹھ دو رسالے
نکال کر ۱۹۲۸ء کا خیر مقدم کریں گے مگر یہ بھی نہ ہوا اور تیرے عہد کا یہ بقیہ کام تیرے فاشن
کے دور سے بیٹھنے میں انجام پایا۔ ۱۹۲۷ء! اگر تیرے عہد میں چار کام وقت پر ہوتا
تو ہم دنگل کے غریب اور کافی ملتے۔ اور تیرے پیش رو سال نے جو ستم آرائی ہم پر کی تھی

اس کی کچھ تخافی ہو جاتی۔

۱۰۔ اہم اس معاملے میں ہم اس قدر تیرے ضرور شکر گزار ہیں گو جو مضامین تیرے عہد میں دنگ از کے صفحوں پر شائع ہوئے وہ عام طور پر پسند کیے گئے اور اکثر ناظرین کو تو یہ دھوکا ہوا کہ یہ مضامین مولانا شریعہ مرحوم ہی کے قلم سے نکلے ہوئے ہیں۔ اور یہ ہمارے واسطے غریب ہے کہ ہمارے ناچیز مضامین میں قدر دانوں کو وہی لطف آیا جس کا چسکا مرحوم نے پیدا کر دیا تھا اور جس کے مزے سے لطف اٹھانے کے واسطے ناظرین دنگ از ہمیشہ کے واسطے مایوس ہو چکے تھے۔

یہ تو تیرا وہ کارنامہ تھا جو تو نے ہمارے ساتھ کیا اب چند اپنے وہ کارنامے بھی سُن لے جو تو نے ہمارے ملک یا ہمارے شہر کے ساتھ کیے ملک کے ساتھ جو تو نے سب سے بُرا سلوک کیا وہ یہ ہے کہ تیرے عہد میں اینٹی کوری کمیشن کے نام سے ایک کمیشن منعقد کیے جانے کی تجویز ولایت میں پاس ہوئی۔ اور اس کمیشن کے پریسیڈنٹ سائمن صاحب منتخب کیے گئے۔ اور چونکہ اس کمیشن میں کسی ہندوستانی ممبر کا انتخاب نہیں کیا گیا اور کوشش کی گئی کہ یہ کمیشن ہندوستانی عنصر سے بالکل پاک و صاف رہے لہذا ہندوستان کی اکثر غیور قوموں نے اسے اپنی کھلی ہوئی توہین و تذلیل سمجھی اور سارے ملک میں ایک ہنگامہ مچ گیا۔

ہمارے بھادران وطن نے مشترکہ فیصلہ کیا کہ کمیشن کا بائیکاٹ کیا جائے اور سارا ہندوستان اس کمیشن سے بالکل الگ تھلگ رہے۔ انھوں نے اپنی یہ کوشش پوری کرنے کے واسطے مسلمان لیڈروں کو اپنی طرف کھینچا۔ اور پنڈت مدن موہن مالویا کے سے زبردست متعصب لیڈر نے بجائے نفاق کے اتفاق کا ترانہ گانا شروع کیا۔ ہمارے پرانے رہبروں کو اپنے افسوس سے تسخیر کیا اور انھوں نے ان کے ساتھ ہندوؤں کے شہروں - شہروں کا بائیکاٹ کا نغمہ الاپا۔ مگر عام مسلمان اُن کے فرقوں میں نہ آئے تیرے اس کارنامہ کا جو ناپاک اثر ہو گا۔ اُس کا حال تو تیرے جانشین کے عہد میں کھلے گا۔ مگر تیرے ہی عہد میں جو ظاہر ہوا وہ کم نہیں ہے یعنی مسلمانوں کے دو حصے ہو گئے ایک حصہ تو شدید کے ساتھ کمیشن کے بائیکاٹ پر تامل ہوا ہے اور دوسرا حصہ اس کے خلاف کمیشن کا خیر مقدم کرنے میں چوٹی سے ایڑی تک کا زور لگا رہا ہے۔ اسی جوش نے مسلم لیگ کے جو مسلمان

کی مشترکہ آواز تھی دو ٹکڑے کر دے اور اس کا ایک اجلاس ملک کے مشرقی سرے کلکتہ میں اور دوسرا اجلاس ملک کے مغربی سرے لاہور میں منعقد ہوا اور ان دونوں نے ایک دوسرے کے خلاف رزولیشن پاس کر کے اپنی عظمت و قوت فنا کر دی۔

اس معاملے میں ہندوؤں کو بھی تو نے کوراہیں چھوڑا تو نے ان کی قومیت کو بھی جس کا وہ زور شور سے نعرہ لگایا کرتے تھے اور اپنی زیادتی تعداد پر نازان تھے اچھوتوں کو ان سے علیحدہ کر کے مٹا دیا۔ اور وہ اپنی حقوق علیحدہ لینے کے واسطے کمیشن سے ہر طرح کا تعاون کرنے کو تیار ہیں۔

ان اہم واقعات کو ہنر کی نفسی لارڈ ارون بہادر و سیراب کشور ہند نے پہلے ہی سے سمجھ کر ہندوستان کے نامی نامی لیڈروں کو طلب کر کے غائبیت کی ایک کیٹی قائم کی کر تو نے ان کی بھی نہ چلنے دی اور وہ کیٹی بجائے اس کے کہ کسی اچھے نتیجے پر پہنچے۔ ایک دوسرے سے نفرت کا سبق لے کر بہ خواست ہوئی۔

تیسرے عہد کا یہ ناپاک واقعہ تو کسی ہندوستانی کے دل سے محو نہ ہوگا کہ تیسرے پر آشوب زمانے میں امریکہ کی ایک ناپاک عورت میر کے ہانے سے ہندوستان میں آئی اور بیان سے ایک ایسی زہریلی کتاب کا مواد فراہم کرنے لگی جس نے ہندوستانیوں کے ماتھے پر ہمیشہ کے واسطے کلنگ کا ٹیکہ لگا دیا۔ اس کتاب کا نام اس نے نادرانڈیا رکھا اور اس میں اس نے کچھ ایسے یہودہ خیالات ہندوستانیوں کی طرف منسوب کیے تھے کہ اس کی شہرت نے چند ہی دنوں میں اس کے کئی ایڈیشن چھپوا دیے۔ اور کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب انھیں چند دنوں میں دس لاکھ سے زیادہ شائع ہو چکی ہے۔ ہندوستانی بھائی ان لغو اور یہودہ خیالوں کو اپنی طرف منسوب دیکھ کر گھبرائے۔ اور اس کے جواب میں نادرانڈیا نامی ایک کتاب اور دوسری اور اور کتابیں بھی لکھیں مگر ہندوستان کی عزت میں جو اب اس کتاب نے ساری دنیا کے سامنے لگا دیا وہ کسی طرح نہیں مٹ سکتا۔

ہندوستان میں بھی اس کتاب کے بیسیوں ترجمے ہوئے مگر مکمل ترجمہ بہت کم ہیں اگر ناظرین دگلڈ از پسند کریں اور انھیں اس کتاب کا صحیح ترجمہ دیکھنے کا شوق ہو تو ہم اپنے غم کے نامور ادیب جناب مرزا محمد عسکری صاحب بی۔ اے۔ کو اس کے ترجمہ

کی تکلیف دین اور اس کے اجزاء ماہ باہ دگلڈ از میں شائع کر دیا کریں۔ تیرے ہم
دگلڈ از کے ذریعہ سے گو دیر میں شائع ہو گا۔ اگر شاہد اللہ بہت ہی صحیح اور بہت ہی دلچسپ ہو گا
اے شاہد! تیری ہم کیا شکایتیں کریں تو نے اپنے آخری عہد میں چلتے
چلاتے ہمارے محبوب ترین لیڈر مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجل خاں صاحب دہلوی کا
اچانک چراغ زندگی گل کر دیا۔ جس سے ہماری رہی سہی قوتوں کا خاتمہ ہو گیا۔
ان کی موت کسی ایک خاندان کا ماتم نہیں ہے بلکہ سارے ہندوستان کے طول و عرض
میں صفت اتم کچھی ہے اور جو ہے اسے مسیح الملک کا رونا دور رہا ہے۔ اور اب ہندوستان
میں ان کی سی ہستی کا پیدا ہونا محال معلوم ہوتا ہے۔ تیرے ہی عہد میں ہمارے شہر
کے نامی گرامی حکیم اور ہندوستان کے سرانیہ ناز طیب جناب حکیم عبدالحفیظ صاحب قبلہ فاج
میں مبتلا ہوئے اور اٹھنے بیٹھنے سے منور ہو کر گوشہ تنہائی میں بیٹھ رہے۔ اس وقت
ساری خلقت ان کی مسحائی سے محروم ہو کے دست دعا اٹھا رہے تھے کہ یا الہی
تیرا جانشین شہید اس ذات ستودہ صفات کے واسطے بابرکت ثابت ہو۔ اور ساری خلقت
ان کے فیض سے دوبارہ بہرہ یاب ہو۔

تو نے خاص ہمارے شہر کے واسطے بھی اچھا سلوک نہ کیا۔ تیرے عہد اولین
میں ہماری مینوسپلی کے ہندو مسلمان مجرب بہت ہی کجبتی سے اپنا کام انجام دے رہے
تھے۔ مگر تجھے یہ پسند نہ آیا اور ان میں بھی خواہ مخواہ میلاد شریف کا رنڈو لیویشن پیش
کر کے آگ لگا دی۔ مسلمان ممبروں سے استغفہ دلوا سے۔ شہر کے مسلمانوں سے جلسے کرائے
حکام وقت سے خوشامد کرائی مگر ان کی ایک جائز خواہش جو ساہا سال سے بلا کسی
جھگڑے کے پوری ہوتی چلی آتی تھی کسی طرح نہ پوری ہونے دی۔

تیرے عہد کا یہ آخری کارنامہ بے شک یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہر محی
شاہ آمان اللہ خان صاحب سیاحت یورپ کے ضمن میں چین اور کراچی ہوتے ہوئے بھی تشریف
لائے اور جامع مسجد بمبئی میں نماز جمعہ پڑھا کے امامت اور خطابت کا حق ادا کیا اور یہ
ضمن ادا کر کے ہندوستان کے ندر دروازے لوگوں کو جو ایک مدت سے اس بات
کے متمنی تھے کہ کسی با اختیار دہالی ملک کے پیچھے نماز پڑھیں مستفید کرایا۔ اور ہندوستان
کو اسلامی مساوات کا بھولا ہوا سبق کہ خدا کی درگاہ میں شاہ و گدا کا ایک رتبہ ہے۔

یاد دلا دیا۔ مگر اس معاملے میں بھی تو اپنی فطرتی شرارت سے باز نہ آیا اور ہمارے دوسرے ہزار کسینسی لارڈ آرون صاحب با نقاہم کو بیار ڈال کے شاہ افغانستان کے استقبال کو محروم رکھا۔ اسے ۱۹۲۷ء جا۔ با ہم تیری زیادہ شکایتیں کر کے دنگلز کے صفحات کو گندہ کرنا نہیں چاہتے اور تیرے بقیہ ناپاک کارناموں پر خاک ڈال کر تجھ سے رخصت ہونے ہیں۔

قدیم ہندوستان میں تعلیم طریقہ تعلیم

اس عنوان کے تحت میں ہم اُن تمام مختلف قوتوں کا تذکرہ کریں گے جن سے طلبہ کو انسان بنانے میں کام لیا جاتا تھا۔ مثلاً استاد کتاب مدرسہ طلبہ کے دنیوی تعلقات وغیرہ وغیرہ یہ سلسلہ ہے کہ استاد کی ذات تعلیم کا عنصر اعظم ہے دنیا میں کوئی شخصیت اس سے بڑھ کر طلبہ کے اخلاق پر اثر نہیں ڈال سکتی۔ اس لیے ضرور ہے کہ استاد کے انتخاب و تقرر میں نہایت احتیاط سے کام لیا جائے۔ طلبہ کی آئندہ زندگی کا فیصلہ اسی کے ہاتھ میں ہے خواہ وہ اُس کو بگاڑے یا بناے بھی وجہ ہے کہ قدما کا معیار اس بارے میں بلند ہوتا تھا۔ چنانچہ ہم ان صفات کا اوپر تذکرہ کر چکے ہیں جو استاد کے لیے نہایت ضروری خیال کیجاتی تھیں۔ کیا یہ قدیم معیار ہمارے جدید اُستاد کے لیے شمع راہ نہیں بن سکتا؟ قدیم ہندوستان میں اُستاد یا تو برہمن ہوتے تھے جو علم و فضل کے لحاظ سے خاص درجہ رکھتے تھے۔ یادہ تاریکین دنیا جو ادھر عمر میں صحرائیں ہو جاتے تھے۔ یہ صحرائیں اس امر سے خوب واقف ہوتے تھے کہ بچوں کی پرورش اور اُن کے قواسد ماغیہ کی تربیت کس طرح کرنی چاہیے۔ ان تجربہ کار بزرگوں کی محبت سے طلبہ کے اخلاق پر نہایت قوی اثر پڑتا تھا۔

قدیم کتابوں کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندوستان میں دو قسم کے تعلیم انیسٹوشن قائم تھے ایک تو وہ جن میں مختلف علوم کے اکیس ماہرین فن درس دیتے تھے جن کے اخراجات خود حکومت ادا کرتی تھی۔ ان درسگاہوں میں منجھی طلبہ تعلیم پاتے تھے دوسرے وہ جن میں معمولی طلبہ پڑھتے تھے اور نسبتاً ان کی تعداد بہت زیادہ

ہوتی تھی۔

چونکہ استاد عموماً حیرانین ہوتے تھے۔ اس لیے مدرسے زیادہ تر جنگلون کے پاس واقع ہوتے تھے آرام کے لیے کسی دریا چشمہ تالاب یا نہر کی قربت کا رکھا جاتا تھا۔ غرض ایسے مقام پر جہاں ہر قسم کے وافر با قدرتی مناظر ہر وقت پیش نظر ہوں۔ لکھ کے نوجوان طلبہ تعلیم پاتے تھے کیا چارے جدید ماہرین تعلیم اس مسئلہ پر غور کر سکتے ہیں کہ ایسے پر نفا مقام پر تعلیم پانے سے طلبہ کے دل و دماغ پر کس قدر قدرتی اور روحانی اثر پڑ سکتا ہے۔

اس سے یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ چونکہ طلبہ شہر سے الگ جنگلوں میں بسر کرتے تھے اس لیے وہ انسانی حق و شعور سے بے بہرہ ہوتے۔ اور سوسائٹی کے نظام اخلاق سے نا آشنا ہوتے تھے۔ بے شہر رہبانیت انسانی ترقی کے لیے سم قات ہے۔ لیکن قدیم استاد عام تعلیم کے ساتھ اس بات کی بھی تعلیم دیتے تھے کہ طلبہ کو دنیا میں کس طرح رہنا چاہیے؟ ان کو آپس میں کس طرح برتاؤ کرنا چاہیے؟ ان کے باہمی حقوق و فرائض کیا ہیں؟ اس لیے اگرچہ طلبہ دنیا سے الگ رہتے تھے۔ تاہم دنیا کے اخلاق و معاشرت سے بالکل ناواقف نہ تھے وہ اکثر شہر میں مختلف اغراض سے آتے جاتے رہتے تھے۔ اور جب کسی گاؤں پر مصیبت آتی تو یہی حیرانین سب سے پہلے غریبوں کی مدد کے لیے تیار ہو جاتے۔ ان حالات کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ باوجود گوشہ نشینی کے ان میں حقوق تمدن کا احساس موجود تھا۔ صبر و تحمل حلم و عفو محبت و ہمدردی خلوص و اختیار انسانی کیہ کر کے عناصر اصلی ہیں جس کمال کے ساتھ یہ صفات روحانی ان بادیہ نشینوں میں موجود تھیں کیا اس کا دسواں حصہ بھی کسی جدید تعلیم یافتہ میں جو ظاہری آرائش و زینت کے لحاظ سے مہر ز رنگار سے کم نہیں پایا جاتا ہے؟ غرض قدیم ہندوستان میں ریشیوں نے حیات انسانی کا جو مرقع تیار کیا تھا۔ اس میں دین و دنیا دونوں کی جھلک نمایاں تھی۔

طلبہ نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ پیدل چلتے تھے۔ نہایت سادہ لباس پہنتے تھے سخت کچھ نوٹوں پر سوتے تھے۔ سادہ غذا میں استعمال کرتے تھے۔ شراب گوشت پختی مریج وغیرہ سے سخت پرہیز کرتے تھے۔ زرق و سرو کی محفلوں میں قطعاً

شریک بنیں ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ ان سے اور بہت سے چھوٹے چھوٹے کام لے جاتے تھے۔ جن کے نام سے بھی شاید آجکل کے طالب علموں کو عار آئے گا۔ مثلاً جھاڑو دینا۔ برتن صاف کرنا۔ پانی نکالنا۔ لکڑی کا ٹنڈا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان کو یاد رکھنا چاہیے کہ یہی چھوٹے چھوٹے کام کرنے والے آگے چل کر اعلیٰ علم و اخلاق پر آفتاب بن کر چمکتے تھے اگرچہ یہ سادگی کسی قدر حد اعتدال سے متجاوز تھی تاہم جو اصول پیش نظر تھا یعنی طلبہ شروع ہی سے محنت و جانفشانی کے خوگر ہو جائیں۔ اس کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے؟ ہم کو ایسے ناز و نعم سے کیا فائدہ۔ جبکہ ہم تھوڑے ہی دنوں میں خدا کی اس اعلیٰ ترین نعمت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ جس پر تمام انسانی ترقیوں کا دار و مدار ہے۔ یعنی صحت جسمانی۔

اس سلسلہ میں طریقہ تعلیم کے متعلق ابھی کچھ کتنا فری سے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قدیم ہندوستان کی تعلیم بالکل تبدیلی ہوئی تھی یعنی درس میں بہت کم کتابیں رہتی تھیں لیکن یہ بالکل واقعہ کے خلاف ہے قدیم استاد کے سامنے مرنے کی سیکڑوں کتابیں ہوتی تھیں لیکن وہ اس کتابی علم کو بہت زیادہ وقعت نہیں دیتے تھے۔ ضروری مواقع پر کتابوں سے کام لیتے تھے ورنہ وہ ہمیشہ طلبہ کی تعلیم میں دو چیزوں کو خاص طور پر کام میں لاتے تھے ایک تو اپنا زبردست حافظہ جس سے وہ خود اپنا رہنما بن کر اور طلبہ کو ان کے اسلاف کے خیالات سے آگاہ کرنے کے لیے کام لیتے تھے۔ اور دوسرے گرد و پیش کو حالاً و واقعات جن سے وہ طلبہ کی قوت مشاہدہ کی تربیت میں کام لیتے تھے حقیقت میں یہی قوت مشاہدہ علم کا حقیقی منبع ہے جس سے ہمارا جدید تعلیم یافتہ گروہ بالکل بے بہرہ ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی نظر باد جو اس قدر درس و تعلیم کے محض سطحی اور عامیانہ ہوتی ہے اور پھر محض ان خیالات تک پہنچنے سے قاصر رہتی ہے۔ اس بنا پر قدیم استادوں کی خاص کوشش ہوتی تھی کہ طلبہ بہ نسبت کتاب کے زیادہ تر صحیفہ قدرت کا مطالعہ کریں تاکہ ان میں ذاتی غور و خوض کا مادہ پیدا ہو۔ اور ہر قدم پر کتاب کی رہنمائی کے محتاج نہ رہیں۔ چنانچہ وہ اکثر میدانوں اور جنگلوں میں تنہا چھوڑ دیے جاتے تھے جہاں وہ عالم قدرت کی ہر چیز کو توجہ کے ساتھ دیکھتے تھے اور ان پر ایسے اسرار شکشف ہوتے تھے جو کتابی علم کے دائرے سے بالکل خارج ہیں۔

علاوہ اس کے استاد ان کو اکثر جسمانی و زرشون کی بھی تعلیم دیتا تھا تاکہ ان کی صحت میں خلل نہ آئے پائے۔ غرض ایسے استاد کے دامن شفقت میں طلبہ کم از کم چوبیسویں

اور زیادہ سے زیادہ اڑتالیسویں سال تک تعلیم و تربیت پانے کے تعلیم ختم ہونے کے بعد شاگرد استاد کی خدمت سے رخصت ہوتا ہے۔ اور نہایت سار و سامان کے ساتھ گھر واپس لایا جاتا ہے۔ جہاں اس کے والدین مدت کے بچھڑے ہوئے عزیز بیٹے کے شوق میں بیتاب رہتے ہیں۔ رخصت ہونے وقت استاد شاگرد کو ان پر شوکت الفاظ میں مخاطب کرتا ہے۔

”سچ بول پاکیزہ زندگی بسر کر۔ شاستر کے مطالعہ سے غافل نہ رہ۔ سلسلہ اولاد کو ترک نہ کر۔ قوم کی تربیت سے غافل نہ رہ۔ بجز نیکی اور کوئی راستہ اختیار نہ کر۔ نام و نمود کے لیے فضول کوشش نہ کر ایسے کاموں سے احتراز نہ کر جن سے علماء اور تیرے بزرگوں کو ناغہ پہنچوانے والدین کو عزت کی نگاہ سے دیکھ۔ معزز نہ ہانوں کی خاطر وضیافت نہ اچھے کاموں کے علاوہ اور کوئی کام نہ کر۔ ہارس محض ان افعال کی تقلید کر جو حقیقت میں اچھے ہوں۔ اور ان کو چھوڑ دے جو قابلِ اعتراض معلوم ہوں۔ محض علما اور پاکیزہ نفس کی صحبت میں بیٹھ اور ان پر یقین رکھ۔ خیرات کر۔ اگر تیرے دماغ میں شکوک پیدا ہوں تو ان لوگوں کا طرز عمل اختیار کر جو انصاف پرست اور پاکیزہ اخلاق ہیں۔ یہ میرا حکم ہے۔ یہ میری نصیحت ہے۔ یہی دید کی تعلیم کا حقیقی راز ہے۔“

یہی قدیم ہندوستان کا کائنات کشن ایڈرس تھا۔
قدیم تعلیم کے تمام اصول اس آپ کے پیش نظر ہیں آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ یہ دین اصول انسانی زندگی کے لیے کتنا تک ضروری اور کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ کیا ہمارے جدید اساتذہ کا فرض محض اس قدر ہے کہ وہ طلبہ کے دماغ کو علوم و فنون سے بھر دیں؟ تربیت اخلاق، حفظانِ صحت کے اہم فرائض کس سپرد کیے جائیں؟“

سُلطان معز الدین کی قیادت میں جہاں الدین بھنگیان

بلہن کی وفات کے بعد وزیر ادا مارنے بجائے کچھو کے کیتباد کو تخت پر بٹھا یا اور بقول ابن بطوطہ وزیر سلطنت نظام الدین کچھو کا دشمن تھا۔ اس نے ایک جعلی محضر جس میں کل امرائے سلطنت کے دستخط تھے کچھو کو دکھا کے کہا کہ تم سب لوگ کیتباد کی بیعت کرنے کو آمادہ ہیں کچھو نے چارہ کا پوچھا تو کہا آپ سندھ میں بھاگ جائیے اس نے کہا کہ سب بھائیوں کو بندہ ہیں اور تمام امرائے دشمن ہیں بھاگ کر کیسے جان بچا سکتا ہوں؟ نظام الدین نے جواب دیا آپ تشریف لے چلیں بھائیوں کی کینیاں میرے پاس ہیں۔ میں اسی وقت آپ کو یہ حفاظت تمام شہر کے باہر کروں گا کچھو نے شکر ادا کیا اور فوراً ایک تیز دم گھوڑے پر سوار ہو کر سندھ کا راستہ لیا۔ اس کے بعد نظام الدین معز الدین کے پاس آیا۔ کچھو کو اس طرح فریب دیکر دہلی سے نکال دینے کا حالی بیان کیا۔ اور امر کو بھی اس کی خبر کی۔ سب نے متفق ہو کر کیتباد کی بیعت کی کیتباد کا جو کہ عقلمند شباب تھا تخت پر بیٹھے ہی عیش و عشرت میں مشغول ہو گیا جتنا کہ کنارے ایک عالی شان کو شک اور جنت کا سا خوش فضا باغ طیار کر کے اس کو خوب دناؤ رک اندام پر بچھا لہون کا مسکن بنایا اور نظام الدین کو وزیر مقرر کر کے کل اختیارات اس کے ہاتھ میں دے دیے۔ بادشاہ کو غافل دیکھ کر نظام الدین کے دل میں تاج و تخت کی ہوس ہوئی۔ لہذا تمام مقربان سلطنت اور امرائے کبار کو جو اس کی راہ میں حائل تھے معمولی الزام دے دیکر خود بادشاہ کے ہاتھ سے قتل کرا دیا۔ اسی اثنا میں مغلوں نے لاہور کے مضافات پر حملہ کیا اور شکست پائی۔ کیتباد کی ہراہی میں ایک مغلوں کی فوج نوکر تھی وہ نظام الدین کے خلاف تھی۔ لہذا اس موقع پر نظام الدین نے یہ ظاہر کر کے کہ یہ لوگ دشمن مغلوں سے ملے ہوئے ہیں اور باہم خط و کتابت رکھتے ہیں سب کو تہ تیغ کرا دیا۔ ان معاملات کی خبریں بھنگیان کو پہنچیں تو اس نے کیتباد کو بہت سے نصیحت آمیز خطوط بھیجے۔ اور جب ان کا کوئی نتیجہ نہ ہوا تو خود فوج لے کر دہلی کی طرف چلا۔ شاہی فوج بھی مقابلہ کو طیار ہوئی۔ اور دریا سے گنگا کے کنارے پہنچ کر بھنگیان کے سامنے صف آرا ہو گئی۔ بھنگیان نے تین روز تک بدرمصالحت آمیز خطوط لکھے اور ان میں بیٹے سے بیٹے کا بھی امرائے ظاہر

کیا۔ مگر نظام الدین نے کوئی بات منظور نہ ہونے دی آخر چوتھے روز عاجز اگر بغراخان نے
کیقباد کو اپنے قلم سے اس مضمون کا خط لکھا کہ "اے فرزند مجھے تیرے دیکھنے کا عید اشتیاق
ہو۔ اور اب زیادہ صبر کی تاب نہیں ہو۔ اپنی صورت حضرت یوسف علیہ السلام کے مانند دکھا کر
تیرے بے نور دیدے کو حضرت یعقوب علیہ السلام کی آنکھوں کی طرح منور کر میں تیری بادشاہی اور
عیش و عشرت میں رخنہ انداز نہ ہوں گا۔ اور آخر میں یہ شعر لکھا۔

گرچہ فردوس مقامی خوش است تیج بہ از لذت دیدار نیست

اس خط کا کیتباد پر بڑا اثر ہوا۔ اور چاہا کہ تنہا باپ کی خدمت میں حاضر ہو کر
 ملاقات سے شرفیاب ہو مگر نظام الدین مانع ہوا اور اس بات پر آمادہ کیا کہ خود
بغراخان شاہی خدمت و حشم کا لحاظ رکھ کے بادشاہ کے سامنے ملاقات کو حاضر
ہو۔ بغراخان نے کمال دور اندیشی سے اس بات کو مان لیا۔ اور دریا پار ہو کر
 بیٹے کے سامنے دست بستہ حاضر ہوا۔ تین مرتبہ حسب دستور زمین بوس ہوا۔ مگر اپنی
 ذلیل حالت اور کیتباد کے کبر کو دیکھ کے جس پر باپ کی اس حالت کا کچھ اثر نہ ہوا
 تھا۔ بغراخان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ یہ دیکھ کر کیتباد سے
 بھی ضبط نہ ہو سکا تخت سے نیچے اتر کے دوڑا اور باپ کے قدموں پر گر پڑا۔ باپ
 نے اٹھا کر گتے لگایا۔ اور دونوں ملکر بہت دیر تک روتے رہے۔ اور تمام رات
 دربار نے بھی اس رونے میں ساتھ دیا۔ اب کیتباد نے باپ کو تخت پر بٹھایا۔
 اور سامنے ادب و تعظیم کے ساتھ کھڑا ہوا۔ اور بہت سی دولت باپ پر سے
 بچھا کر کی۔ یہ صحبت عیش و نشاط چند روز تک گرم رہی جس کا مفصل حال حضرت
 امیر خسرو نے مثنوی قران السعدین میں نظم کیا ہے۔ اب بغراخان نے رخصت
 ہونے کا ارادہ کیا۔ اور چلتے وقت بیٹے کو بہت سی نصیحتیں کیں اور آخر میں گلے
 سے لگا کر کان میں کہا کہ جہاں تک جلد ممکن ہو نظام الدین کی فکر کر۔ ورنہ
 ایک لمحہ کا بھی اسے موقع مل گیا تو تیرا قلع و قمع کر دے گا یہ کہہ کے روتا ہوا
 رخصت ہوا اور اس روز نہ کھا نہ کھایا اور نہ پانی پیا۔ اور اپنے خیمے میں
 بیوی بچہ لگا کر آج کے دن میں نے اپنے تخت جگر کیتباد اور مملکت دہلی کو
 آخری بار رخصت کیا ہے کیتباد باپ سے رخصت ہو کر ادھ کا دورہ کر رہا ہوا

دہلی واپس آیا اور چند درباب کی نصیحتوں پر عمل کرنے پاتا تھا کہ ایک پرینز اد کے
عشق میں دیوانہ ہو گیا اور اُس کے سامنے یہ شعر پڑھا ہے
شب زمی تو بہ کز ہم ناز شاہان باداں رو ساقی باز در کا آورد
اُس سر جبین نے بادشاہ کے منہ سے یہ شعر سنتے ہی جواب میں یہ شعر پڑھا ہے
غزہ ز آفر ہم عابد صد سالہ را موبے پیشانی گرفتہ سوے خار آورد
اور جام کو شراب سے بھر کر بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ بادشاہ نے بھنجا اسے گر گیا
سے پلائے تو پھر کیوں نہ بیچھے "جام ہاتھ میں لے کر بے کلفت پی لیا۔ اور اس
گھڑی سے پھر وہی رنگ رایون کا نقشہ جم گیا۔ اور تھوڑے دنوں بعد شراب
اور عیاشی کی کثرت سے بہت ہی نحیف و لاغر ہو گیا۔ اس وقت اپنی کمزوری
دیکھ کر اُسے بابا کی نصیحت یاد آئی تو نظام الدین کو زہر دلو اسکے اُس کا کام
تمام کر دیا اور اُس کی خدمت پر ملک جلال الدین فرزند کو جو سمانا کا نائب تھا
شالستہ خان کا خطاب دیکر ممتاز کیا۔ مگر صحت میں گھٹن لگ گیا تھا۔ کمزوری
بڑھتی گئی بہانیک کہ نقوہ و فالج میں مبتلا ہو کر صاحب نسبش ہو گیا
بادشاہ نے نا کارگی سے ملک میں بد نظمی ہوئی تو امرائے چاہا کہ خود ہی
بادشاہ بنکر حکمرانی کریں۔ مگر کون کے ایک گروہ نے یہ حال دیکھا تو کقباد
کے سپہ سالار سپر کیو مرثا کو حرم سے نکال کر شمس الدین کا خطاب دیا اور تخت پر
بٹھایا۔ جلال الدین فرزند نے اس سے اختلاف کر کے اکثر امرا اور تمام خلیفوں
کو اپنا ہم خیال بنا لیا۔ اور ترکوں کی قوت توڑ دی۔ اہل شہر نے شمس الدین
کی حمایت کرنا چاہی تو فرخ الدین کو تو ال نے سمجھا بھجا کے انھیں بھی خلیفہ سے روک
دیا۔ اب جلال الدین نے شہر میں داخل ہو کر اُن ترک بچوں کو جن کے باپوں
کو کقباد نے مار ڈالا تھا قید سے آزاد کر کے قسریہ کھری میں بھیجا کقباد بیان
کملوں میں پلٹا پڑا تھا۔ ان لوگوں نے لائین اور چھوٹے مار مار کے اسے شدید
سک اور لاش دریا سے جنما میں پھینک دی۔ یہ واقعہ آخر ۸۸۹ھ کا ہے۔ مگر بعض
مورخین ۸۸۸ھ بتاتے ہیں۔ یہ بادشاہ دو سال اور چند ماہ تخت نشین رہا۔
اس کی یادگار قلعہ کیلو کھری یا قسریہ تھی جس کی شان میں ہم سر

نے ثنوی قرآن العبدین میں لکھا ہے۔
 قصر گویم کہ بھٹے فراخ
 روفتہ طوبے در اوراہ شاخ
 مگر زانے کے دستبرد سے اب اس قصر کا کہیں نشان نہیں ہے۔ اس بادشاہ کے
 سکے میں ایک طرف «السلطان الاعظم عز الدین والدین ابوالمظفر کبکا» اور دوسری
 جانب الامام المستعصم امیر المومنین ہذا البقعة حفرة دہلی» لکھا ہوا تھا۔

قطعات تہنیت

جشن سالگرہ مبارک سلطان العلوم علی حضرت خرد کن

از
 ذاب فصاحت جنگ بہادر حضرت جلیل غلہ

گرہ کے جشن نے پھر رنگ بوستان بدلا
 گون نے جامہ عادل نے آشیان بدلا
 نصیب شاہ میں ابیسی حیات ہے جس سے
 خضر نے سلسلہ عمر جاد دان بدلا

عروس سالگرہ کیسی جلوہ ریز ہے آج
 نیم صبح طرب کیسی شک بینر ہے آج
 نواس ساز کا کیا ذکر ہنرم شاہی میں
 بیان جو تار نفس ہے وہ نغمہ خنجر ہے آج

دن آج وہ ہے جبہ سعادت کو ناز ہے
 معراج مصطفیٰ ہے ماہ رجب کو ناز ہے
 جشن آج وہ ہے جبہ سرت کو ناز ہے
 ماہ رجب پہ شہ کی ولادت کو ناز ہے

عثمان میں پانچ حرفت میں جہاں شکر ہیں
 اس سے کھلایہ راز کہ حافی حضور کے
 نقطے ہیں چار جو گھر شاہوار ہیں
 روز ازل پختن و چار یار ہیں

افخوذ از نظام گزرت

انگلستان کی عورتیں

از مولانا شہر رحیم

جگہ ہوتی ہے اور اس روز خلافت معمول آدمی بھی کچھ زیادہ ہو گئے تھے۔ بہر حال ۲۷
 آدمی تھے جن میں دس سے زیادہ عورتیں تھیں جو لوگ پہلے سے آچکے تھے بیٹھے تھے
 جن میں میں بھی تھا اور جو لوگ بعد آئے اندر بیٹھے کھڑے تھے اور کسی طرح یہ مسئلہ
 طے نہیں ہوتا تھا کہ کمان بیٹھیں اتنے میں ایک صاحب کے کھڑے ہوئے ایک باضابطہ طریقہ
 سے تحریک کی کہ لیڈیان جنٹلمینوں کی گود میں بیٹھ جائیں۔ لیڈیوں کی طرف سے یہ
 تحریک شکریہ کے ساتھ منظور کی گئی۔ اور ایک سوئی سی میم صاحبہ بلا تکلف سیری
 گود میں آ بیٹھیں۔ اور تھوڑی دیر کے بعد جب گاڑی چل چکی تو پھر کے کہنے لگیں مجھے
 افسوس ہے کہ میں آپ کو بہاری سلووم ہوتی ہوں گی۔ اب یہ ایک ایسی چیز ہے کہ آپ
 کے نزدیک انتہا سے زیادہ حیرت میں ڈالنے والی ہوگی۔ مگر اصل یہ ہے کہ وہ وہاں
 اپنے لگا میں شب دروز مردوں سے ملتی جلتی ہیں۔ اور یہ ایک بالکل معمولی بات ہو گئی
 ہے۔ لہذا ہر کسی سے ملنے وقت نہ اُن کے دل میں بُرائی کا خیال ہوتا ہے۔ اور نہ ہر ملنے
 والے مرد میں۔ اور جن لوگوں سے اور قسم کے تعلقات ہوتے ہیں اُن سے اُن کا برتاؤ
 بھی کچھ اور ہی قسم کا ہوتا ہے۔ ہمارے ہم وطنوں کو ان امور کے اندازہ کرنے میں اکثر
 غلطی ہو جاتی ہے۔ اور اسی غلطی کی وجہ سے بعض ہندوستانیوں نے بدگمانی کا دائرہ
 بیان تک وسیع کر دیا کہ محض اس خیال پر کہ عورتیں اخلاق اور خندہ جیسی سے ملتی ہیں
 ہر عورت کو بدکار سمجھ لیا۔ مگر یہ بدگمانی بالکل بیجا اور جو کہ اس سے ایک پاک دہن کی عزت
 پر حملہ ہے لہذا میں کہتا ہوں کہ بہت بڑا گناہ ہے وہاں کے مذاق اور خیال میں جب تک
 عورت کی عفت میں فرق نہ آئے اُس کو کسی بات پر الزام نہیں دیا جاسکتا جو جو
 باتیں ایک شادی کی خواہش کرنے والا یا انگریزوں کی اصطلاح میں کورسٹ
 کرنے والا کر سکتا ہے اُن میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا جاتا۔ اور ہندوستان کا مذاق
 یہ ہے کہ ہاتھ لگاؤ اور کنہا اگر کوئی عورت جان بوجھ کے نامحرم کو اپنی صورت
 ہی دکھا دے تو بھی اُس کی نسبت بے آبروئی کا خیال قائم ہو جاتا ہے۔ اور
 دونوں جگہ کی معاشرت ایسی بدلی ہوئی ہے کہ دونوں خیالات اپنے اپنے حربے
 ٹھیک نہیں مگر یہ بہت بڑی غلطی ہے بلکہ میں کہتا ہوں ظلم ہے کہ وہاں کی عورتوں
 کی عصمت و عفت کا اندازہ آپ اپنی معاشرت کے اصول سے کریں۔ وہاں کی شرفیت

اور بالکرا من عورتوں کی نسبت باوجود بہت غور سے دیکھنے اور تجسس کرنے کے مجھے کبھی بدگمانی کا موقع نہیں ملا۔

ہمارے بعض دوست اور موطن جو انگلستان سے آئے وہ عموماً وہاں کی عورتوں پر بدگمانی کرتے ہیں مگر مجھے یقین ہے کہ ان سے بہت بڑی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ اور یہ غلط فہمی ہر اس شخص سے ہو جاتی ہے جو لندن کو جا کے محض اوپر کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہاں کی سڑکیں ایک خاص وجہ سے انتہادر جھکی نا پاک ہو رہی ہیں جس کا الزام زیادہ تر وہاں کے قانون پر ہے۔ میں نے بعض انگریزوں کو یہ کہتے اور دعویٰ کرتے سنا کہ ہماری قوم میں کوئی بازاری اور فاحشہ عورت نہیں ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ شاید اسی غور کے قائم رکھنے کے لیے وہاں قانوناً اس کی ممانعت کر دی گئی ہے کہ کوئی مکان بدکاری کے لیے کرایہ پر نہ دیا جائے جس کا منشا بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان اپنی سرزمین کو بدکاری سے پاک کرنا چاہتا ہے۔ لیکن ہر ذی ہوش سمجھ سکتا ہے کہ ایسے خلاف فطرت انسانی قوانین سے بدکاری کا سد باب نہیں ہو سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہی بازاری عورتیں جو تمام شہروں کی طرح مکان کرایہ پر لے کر علانیہ رہتیں مخفی طور پر ہر محلہ اور ہر شہر کے ہر حصہ میں شریف عورتوں کی طرح رہنے لگیں۔ اپنی بدکاری کا میدان انھوں نے سڑکوں اور باغوں کو قرار دے لیا ہے۔ اسی قسم کی سائٹ یا سٹریٹ ہزار عورتیں ہر وقت اور علی الخصوص تفریح و تفرج کے اوقات میں لندن کی سڑکوں پر پھیلی رہتی ہیں۔ جو گلی کو چون میں دست فروشوں کی طرح اپنی عصمت بچتی پھرتی ہیں۔ یہ کبھی اتفاقاً کسی کو دوست یا ملاقاتی کی حیثیت سے اپنے گردن میں لے جاتی ہیں۔ ورنہ عموماً ان کی بدکاریوں کے دھگل وہاں کے تمام میوزک ہال جو ایک قسم کے تھیٹر ہیں تمام ہوٹل اور تمام بارز ہمارے ہیں۔ یہ عورتیں کہاں سے آتی ہیں۔ اور کون ہیں۔ اس کا حال آپ کو میرے اوپر کے بیان سے معلوم ہو چکا ہو گا کہ وہی شریف لڑکیاں ہیں جن کو شادی کا لالچ دلا کے بعض بد معاشوں نے خراب کیا۔ سو سائٹی نے چھوڑ دیا وہ شرفانے دست گیری سے بے پردہ والی کی۔ یہ اپنی اولاد کو اس ذلت سے بچانے کی کوشش کرتی

ہیں اور خوب جانتی ہیں کہ اُن سے زیادہ ذلیل کوئی نہیں۔ یہ خود اپنے پیشہ کو چھوڑنا چاہتی ہیں مگر پیٹا نہیں چھوڑنے دیتا۔ یہ عورتیں دہان کی اصطلاح میں اسٹریٹ واکر کہلاتی ہیں۔ یعنی سڑکوں پر پھرنے والی۔ یہ اپنی زندگی سے اس قدر عاجز ہیں کہ اگر دہان کے قانون کی رو سے گداگیری جائز ہو جائے تو بے تکلف بھیک مانگنے لگیں اور اس لعنتی کے طوق کو گلے سے اتار کے پینک دین۔ بلکہ اب بھی اکثر پولیس میں کی آنکھ بچا کے راگبیرون کے سامنے ہاتھ پھیلا دیتی ہیں۔ اور میں خیال کرتا ہوں کہ خود کشی کے واقعات بھی انھیں میں زیادہ پیش آتے ہیں۔ یہی وہ گردہ ہے جس کے لیے رینڈ اور اُس کے ہم خیال ناول نویسوں نے بہت کچھ سرسرا اور انھیں کی وکالت میں آج بھی دہان کے وہ آزاد مشرب لوگ جو نوع انسان کو بلا استثنا دامنیار ایک ہی اسپیش پر لانا چاہتے ہیں زور دے دے کے غل مجا رہے ہیں کہ ان پر لعنت نہ کرو۔ ان کو دروازہ پیسہ نہ دھتکارو۔ بلکہ ان پر ترس کھاؤ۔

الغرض اس طبقہ کی عورتیں دہان کی سڑکوں اور باغوں میں ہر وقت اس قدر پھیلی رہتی ہیں کہ ہرنے والے کو سب سے پہلے انھیں سے سابقہ پڑتا ہے۔ وہ خود اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں۔ اور چونکہ وضع و لباس میں ان میں اور شریف زاد یون میں کوئی فرق نہیں۔ لہذا ایک معمولی نظر سے دیکھنے والے کا خیال قائم ہو جاتا ہے کہ ساری عورتیں آوارہ ہیں۔ مگر ہرگز ایسا نہیں ہے۔ اور میرے دل پر نقش ہے کہ دہان کی شریف زادیوں کی سی ہی پاکدامن و پارسا ہیں جیسی آپ کے بیان ہوئی ہیں۔ اور جیسا کہ ایک پارسا عورت کو آپ کے خیال میں ہونا چاہیے۔

میں سمجھتا ہوں کہ میں نے آپ کی بہت سمیع خراشی کی اور بہت دقت لیا۔ لیکن خوش اور مطمئن ہوں کہ لندن اور اُس کی عورتوں کی جو اجالی تصویر میں نے آپ کو دکھائی ہے اس کو آپ جہاں تک تحقیقات سے کام لیں گے زیادہ صحیح اور مطابق اصل پائیں گے اب میں آپ کی توجہ اور زحمت فرمائی کا شکریہ ادا کر کے رخصت ہوتا ہوں۔

ضروری اطلاع

قدر دانان دگلڈ ازاد دگلڈ از کا یہ سال ختم ہو گیا۔ اور سال بھر کے بارہ پرچے آپ کی

خدمت میں پہنچ گئے۔ سالہا سال کے قاعدہ کے موافق ۱۹۲۷ء کے چندہ دگلڈاز کو ٹیپا
 ناول بھیج کر وصول کرنا چاہیے تھا۔ مگر نولانا شرم مرحوم کے اٹھ جانے سے دیناے ادب
 کو جو نقصان پہنچے انہیں سے ایک یہ بھی ہے کہ جو نولان اس سال بطور ہم یہ تقسیم کرنے
 کے واسطے لکھا گیا تھا وہ مولانا مرحوم کے ان ناولوں کے دیکھنے پر سے جو گذشتہ
 سالوں میں دیے جاسکے تھے کسی طرح اس قابل نہیں ہے کہ خریداران دگلڈاز کو خدمت
 میں پیش کیا جاسکے۔ یہ خرابی دیکھ کر میں نے خود ایک ناول لکھنا شروع کیا ہے مگر مگر ضرورتوں
 میں مصروف ہونے کی وجہ سے اس کے جلد طیار ہونے کی امید نہیں اور جب تک وہ طیار
 ہو کر چھپے گا ۱۹۲۸ء کا نصف سے زائد حصہ گزر جائے گا۔ لہذا مسئلہ کا چندہ
 دگلڈاز وصول کرنے کے واسطے مسلمان تاجداران ہند حصہ اول و حصہ دوم جو حال
 ہی ہیں دگلڈاز پریس سے شائع ہو رہے ہیں۔ اور جس میں خلافت راشدہ سے لے کر سلطان
 تیمور کے جلے تک ہندوستان کے مفصل واقعات نہایت سادہ زبان میں مختصر طور پر
 لکھے گئے ہیں۔ اور تقریباً دو سو صفحات پر ختم ہو رہے ہیں۔ کادی پی گزشتہ سالوں
 کے مطابق مارچ ۱۹۲۸ء میں خریداران دگلڈاز کی خدمت روانہ ہو گا۔
 یہ وی پی محصول ڈاک و فیس رجسٹری ملا کر ہم اکا ہو گا خریداران دگلڈاز نوٹ
 کر لیں۔ اور اس درمیان میں اگر کہیں ابھر جانا جائے تو ملازمان کو اس کے وصول
 کرنے کی ہدایت کرنے جائیں تاکہ وی پی واپس نہ ہو۔
 آخر میں یہ بھی گزارش ہے کہ جو صاحب آئندہ سال خریدار نہ رہنا
 چاہیں وہ بذریعہ ایک کارڈ کے یہ پرچہ پہنچتے ہی ہمیں اطلاع دے دیں
 تاکہ ان کی خدمت میں وی پی نہ روانہ کیا جائے۔

خاکسار محمد صدیق حسن۔ ایڈیٹر دگلڈاز

کمرہ بزن بیگ خان۔

لکھنؤ

